سہ ماہی

کاروان ادب

جلد-۲۵ | اپریل، مئی، جون ۲۰۱۸ء | شمارہ-۱

مجلس مشاورت

● مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی ● مولانا حافظ فضل الرحیم ● ڈاکٹر محمود الحسن عارف ● مولانا محمد سلطان ذوق ندوی

مشرف عام

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

صدر رابطہ ادب اسلامی شعبۂ برصغیر

مدیر مسئول

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

مدیر تحریر

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی

مدیر معاون ڈاکٹر تابش مہدی

مجلس ادارت

● مولانا نذر الحفیظ ندوی، لکھنؤ ● ڈاکٹر سید ضیاء الحسن، لکھنؤ ● ڈاکٹر شفیق احمد ندوی، دہلی ● مولانا محمد الیاس بھٹکلی ندوی، بھٹکل

معاون انتظامی اقبال احمد ندوی

-: زرتعاون :-

اس شمارہ کی قیمت: ۵۰ روپے، سالانہ برائے ہندوستان ۲۰۰ روپے پاکستان و بنگلہ دیش: ۳۰۰ روپے یا ۱۰ امریکی ڈالر ان کے علاوہ دیگر ممالک: ۴۰۰ روپے

چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں

RABITA-AL-ADAB-AL-ISLAMI(INDIA)

-: صدر دفتر :- رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

Designed & Printed at : Mashhud Enterprises Lko. Mob. 9839133588, 9451947786

فہرست

افتتاحیہ	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۳
اداریہ	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۶
مناجات	مقبول الٰہی	۹
نعت	ڈاکٹر تابش مہدی	۱۰
اُردو زبان وادب کا ارتقا اور موجودہ صورت حال	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۱۱
اُردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں مدارس کا حصہ	مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی	۱۴
اُردو رسم الخط اور خوش نویسی کے تحفظ وفروغ میں مدارسِ اسلامیہ کا حصہ	ڈاکٹر شکیل احمد	۲۱
تعمیر ملت میں مدارسِ اسلامیہ کا حصہ	مولانا اقبال احمد ندوی	۲۴
ادب نبوی کا انسانی پہلو	مولانا انعام اللہ قاسمی	۲۹
انسانیت کی خدمت کا قرآنی تصور	مولانا محمد طیب ندوی	۳۴
خدمت انسانیت میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا معتدل ادبی رویہ	مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۳۶
خطبات مدراس اور انسانیت کا ادراک	مولانا عمیر الصدیق ندوی	۴۴
ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی سیرت نگاری	ڈاکٹر احسان اللہ فہد (علی گڑھ)	۴۸
حضرت صوفی غلام محمدؒ	مولانا محمد جمال الرحمٰن مفتاحی	۵۸
دکن میں اردو نعت گوئی	ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی	۶۱
اورنگ آباد کے نعت گو	ڈاکٹر عبد الرشید ندوی مدنی	۶۶
انسانی خدمت میں صحافت کا حصہ	مفتی سید باقر ارشد قاسمی	۷۳
آہ ارضِ فلسطین! (نظم)	شمسی قریشی	۷۶
غزلیات	سعدیہ صدف، ڈاکٹر طاہر الدین طاہر	۷۸
غزلیات	طالب رام پوری، ڈاکٹر رؤف خیر	۷۹
غزل	مدحت الاختر	۸۰

افتتاحیہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

عربی زبان وادب اپنے تسلسل کے لحاظ سے طویل ترین عمر کا حامل ہے۔ جب کہ دوسری زبانیں صرف کئی کئی صدیوں کی عمر تک محدود نظر آئیں گی۔ اس کے لحاظ سے عربی زبان وادب کو بھی پانچ چھ سو سال میں بدل جانا چاہیے تھا یا ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن یہ زبان وادب جب اپنی قوت وپختگی کے بلند معیار کو پہنچا تو اس میں اللہ تعالیٰ کے کلام قرآنِ مجید کا نزول ہوا اور اس کی حفاظت کا وعدہ بھی ہوا۔ اس نے اس کو دائمی بنا دیا، اور جب قرآنِ مجید دائمی ہوا تو اس کے تحت یہ زبان بھی دائمی ہوگئی۔ عربی زبان وادب عربوں کے فطری مزاج کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ قرآنِ مجید کی رہنمائی سے اعلیٰ تعلیمات کا بھی حامل ہوا۔ ان کے عہدِ اول کی فطری شاعری اور قرآنِ مجید کے آنے کے بعد علمی خصوصیات کے اضافے نے ان کی نثر میں اور بھی خوبی وترقی پیدا کی۔

لیکن جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے تو وہ اپنے فطری مزاج کے لحاظ سے ان کے طبعی احساسات کی ترجمان رہی جو اُن کی قبلِ اسلام اور ابتداءِ دورِ اسلام کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ اور انسانوں کی طبیعت چونکہ اپنے فطری دائرے میں ایک دوسرے سے یکسانی رکھتی ہے، اس لیے عربوں کے عہدِ اول کی شاعری سننے والے کے فطری احساس کو اپیل کرتی تھی اور چونکہ ان کے یہاں تعلیمی مصروفیت نہ تھی اور تمدنی مزاج نہیں بنا تھا، لہٰذا اس طرح ان کا مزاج فطری خصوصیت کا حامل بنا۔ اس صورت میں ان کے کلام وبیان سے ذہین اور غیر ذہین دونوں طرح کے افراد متاثر ہوتے تھے۔ مزید یہ کہ تعلیم اور تمدنی حالات نہ ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی میں فرصت کے اوقات بہت تھے۔ فرصت کی مجلسیں ہوتیں اور سخنِ شعری سے دلچسپی لی جاتی تھی۔ اور وقت بے وقت معاشی ضرورت یا قبائلی حمیت کے اثر سے جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ اور جنگ کے نتائج سے احساسات وجذبات پر گہرا اثر پڑتا تھا۔ دشمنوں اور اپنوں کے قتل ہونے اور غیروں کو زیر کرنے اور انتقام لینے اور کامیابی پر اپنی برتری کے نغموں سے مسرور ہونے میں اور ناکامی کی صورت میں انتقامی جذبہ ابھرتا تھا۔ دونوں صورتوں میں ان کی شاعری ان کے دلی تقاضوں کی مؤثر ترجمانی کرتی تھی۔ اس طرح ان کی شاعری ان کی زندگی کے حساس پہلوؤں کی دلکش تصویر پیش کرتی تھی۔ اسی بنیاد پر " الشعر دیوان العرب " کی اصطلاح ان کی شاعری کی خصوصیت بیان کی گئی۔

اسی بنا پر یہ سوال کہ عرب کیا تھے؟ ان کی زندگی کے کیا اقدار تھے؟ اور ان کے فطری احساسات کیا تھے؟ یہ سب ان کی شاعری سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کی طبعی

خصوصیات کے تحت ان کے احساسات وحالات نے سخاوت اور شجاعت کو بھی ان کے فخر واحساسِ عزت کا ذریعہ بنادیا تھا جس کا اظہار ان کی شاعری میں بخوبی ہوتا ہے۔

اس طرح ان کی شاعری میں ان کے احساسات کا اظہار طبعی اور فطری کیفیت کا حامل ہوتا تھا جب کہ متمدن قوموں میں تخیلاتی کیفیت کا اختیار کرنا زیادہ کمال کی بات سمجھی گئی ہے۔ عرب جب بتدریج اسلامی سرکردگی میں علمی وتمدنی میدان میں آگے بڑھے اور دوسری قوموں سے ان کو واسطہ پڑا تو ان کے ادب وشاعری پر اس کے اثرات بھی پڑے۔ یہ اثر خاص طور پر نثر کے دائرے میں ہوا اور اس کو قرآنِ مجید اور حدیث شریف کے اثر سے بتدریج بہت فروغ ملا۔ اس طرح عربی ادب کو نثر وشعر دونوں میدانوں میں حسبِ ضرورت اچھے نمونے پیش کرنے کا موقع ملا۔

عربوں کی خشک سالی کی زندگی اور غیر تمدنی حالات نے ان کے مزاج میں زندگی کی حفاظت کی لازمی صورتوں کے لیے طبیعت میں ہمت و بہادری کا پُرزور جذبہ اور علاقائی حالات کی دشواری نے سخاوت کا عمل بہت ابھار دیا تھا، اور یہ عمل وقوع پذیر ہونے کے ساتھ ادبِ شعری میں زیادہ ابھر کر سامنے آتا تھا اور فخر ورثاء اور مدح وہجو میں خاص طور پر ظاہر ہوتا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کیفیتیں انسانی طبعی کیفیتیں ہیں، لہٰذا ان کا اظہار کرنے والے کے لیے بھی اور سننے والے کے لیے بھی شوق و پسند کا حامل ہوتا تھا۔ اور اس کے بعض بعض اسلوبِ اظہار متعلقہ افراد پر غیر معمولی اثر ڈال دیتے تھے۔ بعض بعض موقعوں پر اس سے متاثر افراد شرمندگی محسوس کر کے لوگوں سے منہ چھپانے لگتے تھے، جیسا کہ جریر کی ہجو کے اثر سے خاندانِ بنی نمیر کو پیش آیا:

فغض الطرف إنك من نمير
فلا كعبًا بلغت و لا كلابا

(ترجمہ: تمھیں مارے شرم کے اپنی نگاہیں جھکا لینی چاہئیں، کیوں کہ تمھارا تعلق قبیلۂ نمیر سے ہے۔ اور تمھارے گھٹیا پن کا یہ حال ہے کہ نہ تم کعب کے مقام تک پہنچے اور نہ کلاب ہی کی خصوصیات تمھارے اندر پیدا ہوسکیں)

اور اسی سے ملتا جلتا واقعہ حطیئہ کے شعر:

دع المكارم لا ترحل لبغيتها
و اقعد فإنك أنت الطاعم الكاسي

(ترجمہ: تم عظمتوں کا خیال چھوڑو، ان کے حصول کی نہ کوشش کرو، نہ ان کے لیے سفر کرو، ان کا خیال چھوڑ کر گھر میں بیٹھ رہو۔ کیوں کہ تم تو اپنے کھانے پینے اور لباس کے سلسلے میں بھی دوسروں کے دست نگر ہو، تمھیں عظمتوں سے کیا لینا دینا) سے متاثر فرد نے اثر لیا تھا اور اس پر شاعر کو سزا بھی ملی تھی۔

اور بنی انف الناقہ کے قابلِ فخر خطاب میں تحقیر کا پہلو دکھا دینے سے پریشان ہو کر اس کے ازالے کے لیے شاعر سے مدد لی گئی تو شاعر نے اپنے شعر میں اس طرح پیش کیا کہ اس کا خراب تصور ختم ہوگیا۔ شاعر نے اس کو اس طرح کہا:

قوم هم الأنف و الأذناب غيرهم
فمن يسوي أنف الناقة الذنبا

(ترجمہ: لوگوں میں بنو انف الناقہ کی حیثیت ناک کی ہے جب کہ دوسروں کی حیثیت دُم کی ہے۔ اب بھلا اونٹنی کی ناک

اور دم میں کیا نسبت؟ کہاں ناک اور کہاں دُم؟ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک!!!)

اس عہد کے ایسے مؤثر کلامِ شعری میں سادہ لیکن مؤثر عشق و محبت کا اظہار اور بہادری کے موضوع پر مختلف موقعوں پر مؤثر شعری انداز سے ملتا ہے۔ شاعر اظہارِ عشق میں کہتا ہے:

صبا قلبي و مال إليك ميلا
و أرّقني خيالك يا أثيلا
يمانية تلم بنا فتبدي
دقيق محاسن و تكنّ غيلا

(ترجمہ: میری محبوبہ اثیلہ! میں نے دل تم کو دیا۔ وہ تم پر پوری طرح فدا ہو گیا۔ تمھارا خیال و تصور تو مجھے اب سونے بھی نہیں دیتا کیوں کہ میرا حال یہ ہو گیا ہے کہ بیٹھے ہیں ہر وقت تصورِ جاناں کیے ہوئے۔ میری محبوبہ یمن کی رہنے والی خوش جمال ہے، یہ اس کی کرم گستری ہے کہ ہمارے خیالوں میں آ کر چشمِ تصور سے ہی اپنا دیدار کرا دیتی ہے اور ہمارے سامنے اپنے لب و رخسار اور دندانِ آبدار کے حسن کی باریکیاں ظاہر کرتی ہے جب کہ قابلِ ستر اعضاء کو ہم سے مخفی رکھتی ہے)

اور بہادری کے اظہار میں کہا ہے:

فإنك لو رأيت الخيل تعدو
عوابس يتخذن النقع ذيلا
رأيت على متون الخيل جنّا
تفيد مغانمًا و تفيت نيلا

(ترجمہ: اگر تم ہمارے گھوڑوں کو تھکن سے چور، درشت خو و ترش رو، گرد و غبار کے جلو میں اس طرح دوڑتا ہوا دیکھ لو کہ وہ اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے گرد و غبار کو کپڑے کے دامن کی طرح اپنے پیچھے اڑاتے ہوئے دوڑ رہے ہوں تو تمھیں لگے گا کہ ان کی پیٹھوں پر جن بیٹھے ہوئے ہیں جو دشمن سے مالِ غنیمت حاصل کر لیتے ہیں، اور انھیں جو ملا ہوتا ہے، اس سے ان کو محروم کر دیتے ہیں۔

اور وطن کی محبت میں کہتا ہے:

قفا ودّعا نجدًا و من حل بالحمى
و قل لنجد عندنا أن يودعا
بنفسي تلك الأرض ما أطيب الربا
و ما أحسن المصطاف و المتربعا
و ليست عشيات الحمى برواجع
عليك و لكن خل عينيك تدمعا

(ترجمہ: ساتھیو! رکو، نجد اور اِس دیار کے باسیوں سے رخصت تو ہو لو، حالانکہ نجد وہ دیار نہیں کہ اسے چھوڑ کر جایا جا سکے۔ اس سرزمین پر میرے دل و جاں قربان، کتنے عمدہ ہیں یہاں کے ٹیلے اور کیا ہی خوب ہیں یہاں کی موسمِ گرما اور موسمِ بہاراں کی قیام گاہیں۔ بھائی اب وہاں کی گزری ہوئی راتیں دوبارہ واپس آنے سے تو رہیں، ہاں اُن کی حسرت میں تم اپنی آنکھوں کو اشکوں کی برسات کی اجازت دے سکتے ہو)

عربوں کے اول عہدِ شعری میں یہ انداز بڑا دلنواز نظر آتا ہے جس سے ان کی فطری زندگی کی خصوصیات بھی ظاہر ہوتی ہیں اور اثر پذیری بھی نمایاں ہوتی ہے۔ اور یہ ان کے فطری احساسات کے متنوع پہلوؤں کی تصویر بھی پیش کرتی ہے۔ اسی بنا پر اس کو " الشعر ديوان العرب " کہا گیا تھا۔

(اداریہ)

مسجد اقصیٰ-قبلۂ اول

جفا کی خو بدل سکتی ہے کیا فریادِ بسمل سے!!!

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

یروشلم یروشلم ! گذشتہ چند دنوں سے پورے عالمِ اسلام میں اضطراب کی لہر دوڑی ہوئی ہے۔شورِ نالہ وشیون سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ ہر جگہ احتجاجی جلسے ہورہے ہیں، امریکہ کے خلاف مذمت کی قرار دادیں پاس ہورہی ہیں، عرب لیگ کی کانفرنس قاہرہ میں ہوچکی اور مذمت کی تجویز پاس ہوئی۔لبنان کے نمائندے نے امریکہ کے اقتصادی بائیکاٹ کی تجویز پیش کی جو منظور نہیں ہوئی۔ وقار اور عزتِ نفس عربوں کے پاس باقی نہیں رہ گئی ہے۔اسلامی ممالک کی کانفرنس ترکی میں ہوئی جس میں یروشلم کو فلسطین کا پایۂ تخت بنانے کا عزم کیا گیا، لیکن اس کانفرنس میں سعودی عرب، مصر، بحرین، متحدہ عرب امارات کی شرکت نہیں ہوسکی اور جس معمولی سطح پر ان ملکوں کی نمائندگی ہوئی، اس اعتبار سے اسے عدم شرکت ہی سمجھا گیا۔ یہ غیب وحضور بہت معنی خیز تھا۔دل زخمی ہیں، آنکھیں خونابہ بار ہیں، کیونکہ مسئلہ یروشلم کا ہے، القدس کا ہے، قبلۂ اول کا ہے۔ یہ وہ مقدس سرزمین ہے جو معراج میں آپ (ﷺ) کی گذرگاہ رہی ہے۔سورہ بنی اسرائیل کی آیت کا ترجمہ ہے ..''پاک ہے جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجدِ حرام سے دور کی اس مسجد (مسجدِ اقصیٰ) تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے تاکہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ حقیقت میں وہی ہے سننے والا اور دیکھنے والا''۔بہت سارے انبیا نے اس مقدس سرزمین پر قیام کیا ہے۔یہی وہ جگہ ہے جہاں امام الانبیا سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیا کی امامت کی تھی۔فلسطین اور بیت المقدس صدیوں سے مسلمانوں کے قبضے میں رہا ہے۔ترکوں کی خلافت ختم ہوئی اور عالمِ اسلام کی بندر بانٹ ہوئی تو فلسطین انگریزوں کے قبضے میں آیا۔ ۱۹۱۷ء کو برطانوی وزیر خارجہ بلفور نے فلسطین میں ایک نئی ریاست قائم کرنے کا اعلان کردیا تھا اور پھر یہاں پوری دنیا سے یہودیوں کو لاکر بسایا گیا اور پھر اسرائیل کے ساتھ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں یروشلم بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن یہ صرف مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا ہے، دل سے نہیں نکلا ہے۔

مسلمان اس کے لیے جان دے سکتے ہیں، اس پر دوسروں کا قبضہ تسلیم نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کا مقدس مقام ہے۔ مکہ اور مدینہ کے بعد سب سے زیادہ مقدس یہی سرزمین ہے اور اس کی حفاظت اور اس کی بازیابی کی کوشش عالمِ اسلام پر فرض ہے اور وہ مسلم حکومتیں جو اس کے گردنواح میں بستی ہیں، ان پر فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ مسجدِ اقصیٰ کو پنجۂ یہود سے نکالنے کی کوشش کریں۔

ظاہر ہے کہ اس کے لیے طاقت کا حصول ضروری ہے، اسی لیے قرآن نے بہت وضاحت کے ساتھ، بڑی صراحت کے ساتھ، بہت صاف لفظوں میں جنگی تیاریوں کا حکم دیا ہے اور تیاریوں کا معیار یہ کہہ کر متعین کر دیا ہے کہ تمہاری تیاریوں سے اور طاقت کے ساز وسامان سے خدا کے دشمن اور تمہارے دشمن مرعوب اور دہشت زدہ ہو جائیں۔ امریکہ اور اسرائیل پر مذمت کی قرار داد اقوامِ متحدہ تک میں پاس ہوئی۔ اس کے پاس کرنے کا کیا اثر پڑے گا، بظاہر کچھ کہنا مشکل ہے ،ان کا ظلم بڑھتا رہے گا، کم نہیں ہوگا، بسمل کی فریاد سے دنیا میں ظالم کا ظلم کبھی کم نہیں ہوتا ہے۔ اِس وقت دنیا کے ہر ملک میں مسلمان اس بات پر احتجاج کر رہے ہیں کہ امریکہ نے اسرائیل کے اس دعوی کو تسلیم کر لیا ہے کہ بجائے تل ابیب کے یروشلم اسرائیل کا پایۂ تخت ہوگا اور امریکہ کے صدر ڈونالڈ ٹرمپ نے اپنے سفارت خانے کو تل ابیب سے یروشلم منتقل کرنے کا حکم دے دیا۔

یہ بات بھی گوشۂ ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہ امریکی اقدام نہ عاجلانہ ہے، نہ ناگہانی ہے، نہ تحیر خیز ہے۔ امریکی کانگرس نے ۱۹۹۵ء میں امریکی سفارت خانے کو تل ابیب سے مقبوضہ بیت المقدس منتقل کرنے کی قرارداد منظور کی تھی، اُس وقت سے ہر امریکی صدر انتخاب کے موقعے پر قرار داد کو روبعمل لانے کا وعدہ کرتا ہے۔ ٹرمپ نے بھی وعدہ کیا اور وعدہ وفا کیا۔ مسلم عرب ملک اس پورے عرصے میں باہمی کشت وخون میں مشغول اور برادر کشی میں مبتلا رہے اور امریکی صدر کو یہ کہہ کر دعوت دیتے رہے کہ ''مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے'' چنانچہ یہ معزز مہمان ''چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے'' درِ دولت پر آ گئے اور مہمانِ عظیم کے استقبال کے لیے عرب ملکوں نے دیدہ ودل دونوں فرشِ راہ کر دیا اور نذرانوں اور تحائف سے ان کو مالا مال کیا گیا۔ مالا مال ہونے کے کچھ عرصے کے بعد ایک ادائے بے نیازی سے مہمان نے وہ اعلان کر ڈالا جو اَب تمام مسلمانوں کے لیے سامانِ گریہ ہے۔

پوری دنیا میں ڈونالڈ ٹرمپ کے اعلان کے بعد چیخ وپکار ہو رہی ہے جلسوں اور جلوس کا سلسلہ جاری ہے، اور دنیا میں تمام انصاف پسند بھی کہہ رہے ہیں کہ ٹرمپ نے اسرائیل کے مطالبے کو منظور کر کے فلسطین کے مسئلے کو اور بھی زیادہ پیچیدہ بنا دیا ہے۔ فلسطینی زیادتیوں کا شکار ہو رہے ہیں ،ہزاروں کی تعداد میں ان کی جانیں ضائع ہو رہی ہیں، مزاحمت کی تحریک نے ان کے حوصلوں کو بلند کیا ہے، وہ

شہادت سے سرخرو ہو رہے ہیں لیکن ان کی حالت دنیا کے مسلمانوں کو خون کے آنسو رلاتی ہے۔ لیکن ایک بنیادی بات جو احتجاجات کے کسی اسٹیج سے نہیں کہی جا رہی ہے، وہ یہ کہ فلسطین کا مسئلہ بڑی حد تک عرب ملکوں کے سربراہوں کی مدہوشی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اللہ تعالی نے انہیں سیال سونے کی دولت کا جو سمندر دیا تھا، حکمرانوں نے اس دولت کا صحیح مصرف نہیں لیا، صحیح منصوبہ مندی نہیں کی، کارخانے نہیں قائم کیے، سائنسی اور صنعتی انقلاب لانے کی کوشش نہیں کی، تمام سامان باہر کے ملکوں سے درآمد کرتے رہے اور اپنے عشرت کدوں میں دادِ عیش دیتے رہے۔ علم کی دنیا میں سائنس میں اور ٹکنولوجی کے میدان میں ترقی، کامیابی کی لازمی شرط ہے۔ طاقت کے ذریعے سے طاقت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ عربی زبان کی ضرب المثل ہے "الحرب أنفی للحرب" یعنی عسکری طاقت ہی عسکری طاقت کو لگام دے سکتی ہے۔ اس لیے صرف احتجاج کرنے سے یہ مسئلہ حل ہونے والا نہیں ہے۔ بقول شاعر: جفا کی خو بدل سکتی نہیں فریادِ بسمل سے۔ اور بقول اقبالؔ۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتوی ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

فلسطین کا مسئلہ نیا مسئلہ نہیں۔ پہلے سینے میں زخم لگتا تھا تو قلم سے بھی خون ٹپکتا تھا، ادبی شہپارے وجود میں آتے تھے۔ لوح و قلم کی بساط سجائی جاتی تھی۔ اب کسی کو ادب تخلیق کرنے کی فرصت نہیں۔ نہ احساس کی شدت ہے نہ زبان پر قدرت ہے۔ نہ انگلیاں فگار ہیں، نہ خامہ خوں چکاں ہے، دیکھیے اسی مسئلۂ فلسطین پر پہلے ادبی اعتبار سے کیسی معتبر مؤثر دلگداز نظم لکھی گئی تھی۔ فلسطین پر نعیم صدیقی کی بہت طویل نظم ہے جس کے چند بند ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔

لہو اگل رہا ہے آج میرا پر فنوں قلم
شکستِ آرزو کا کیا فسانہ ہو سکے رقم
خیال پرزے پرزے ہیں کروں میں کس طرح بہم
یروشلم یروشلم !

یروشلم یروشلم ! تو اک حریم محترم
ترے ہی سنگِ در پہ آج منہ کے بل گرے ہیں ہم
تجھے دیا ہے ہاتھ سے بزخمِ دل بہ چشمِ نم
یروشلم یروشلم !

جہاں کی ساری راحتیں سپرد سیلِ نار کیں
کئی ہزار متقیں گلی گلی نثار کیں
ترے وقار کے لیے لہو دیا قدم قدم
یروشلم یروشلم !

یہیں سے ہو کے عرش کو سواری نبیؐ گئی
ابھی تک ان فضاؤں میں ہے اک مہک بسی ہوئی
یہاں کے خاک پر ٹکے، براقِ نور کے قدم
یروشلم یروشلم !

☆☆☆☆☆☆

مناجات

مقبول الٰہی

مالك الملك، لا شريك ہے تو
أشهد لا إله إلا هو
نورِ ارض و سما میں رخشندہ
رنگِ صبح و مسا تری خوشبو
تیرے خادم ہیں کلھم أفلاك
اور مخدومِ ذرہ ذرہ تو
کُن کے لفظِ طلسم سے پیدا
کائ کی کائناتِ شش پہلو
کالے، پیلے، سفید، سرخ نژاد
تیری صناعیوں کی نشو و نمو
دے کے اسود کو جسم نافہ نما
اس کی آواز میں بھرا جادو
میری تخییل، یہ ندیمِ قدیم
تیرا انعام بے نہایت و سو
تیری بخشش، مسرت و غم میں
صدفِ چشم میں نہاں لُولُو
ہے یہ برحق کہ خاک میری نہاد
پھر ثنا و صلوٰۃ اور یہ گلو
سب پہ یکساں ہے تیرا فیض یہاں
نہیں تفریقِ آمنوا، کفروا
شفقِ شام، شاہدِ شہداء
رفعتوں کا امیں ہے ان کا لہو
بے طلب نعمتیں ہمیشہ تری
میری طاعت، ہمیشہ حیلہ جو
اس کشائش سے آزمائش میں
رہا مائل ہوں میں بہ نخوت وسو
مجھ پہ بارانِ نعمتِ دنیا
میری عصیاں تو تیری غفراں، خو
میرے خواب وخیال کیوں دن رات
بن رہے ہیں عذابِ بے قابو

نعت

ڈاکٹر تابش مہدی

جس روز سے طیبہ ہوا میرے لیے دیدہ
لگنے لگی ہر نعمتِ فردوس چشیدہ

میں بھی تری رحمت کا طلب گار ہوں شاہا!
حالاں کہ ہے دامن مرا عصیاں سے دریدہ

جو لوگ جمالِ شہِ خوباں سے ہیں محروم
دیکھا ہے اُنھیں میں نے ہر اک در پہ خمیدہ

جو سنتِ سرکارِ مدینہ کا ہے پیرو
ایمان کی پوچھو تو وہ ہے خلد رسیدہ

محدود نہیں ہے تو کسی عہد و مکاں تک
خوش بو ہے دو عالم میں تری اے گلِ چیدہ

اے کاش کہیں حشر میں جبریل یہ مجھ سے
وہ شاہِ اُمم آگیے تو کیوں ہے کبیدہ

ظاہر یہ ہوا سیرتِ اصحاب سے تابشؔ
ہر پھول گلستانِ رسالت کا ہے چیدہ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اردو زبان وادب کا ارتقا
اور موجودہ صورتِ حال

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
صدر رابطہ ادبِ اسلامی، لکھنؤ

اردو زبان برصغیر کے جنوبی اور شمالی ومرکزی علاقوں میں پیدا ہوکر نشو ونما پانے والی زبان ہے۔ اس کو مذکورہ بالا علاقوں میں عملاً قومی زبان کی طرح استعمال کیا گیا اور ان علاقوں کے بسنے والے صرف مسلمانوں نے ہی نہیں بلکہ شمالی ہند کے غیر مسلموں نے بھی اپنی پسند کی زبان سمجھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ہمارے ہندو اور سکھ بھائیوں میں بھی اردو کے بڑے مایہ ناز ادیب وشاعر ہوئے ہیں، جن کو اس کے لیے کسی نے مجبور نہیں کیا تھا، اور نہ وہ اس بات کی مجبوری محسوس کرتے تھے کہ اردو کو اپنی تالیفات اور اپنی شاعری میں اختیار کریں، بلکہ یہ ان کے ماحول اور ذاتی ذوق کی وجہ سے تھا۔ اس طرح اردو کو ایک مشترک اور مختلف زبانوں کے سنگم کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اور وہ برصغیر کے شمالی اور وسطی علاقوں میں عام گفتگو کی اور گھریلو زبان بنی۔

اردو کے وجود میں آنے کے وقت ملک کے مرکزی اصحابِ اقتدار کی زبان عموماً فارسی تھی اور حکومتی سطح کے معاملات میں لوگوں کو وہ زبان سیکھنا پڑتی تھی اور اپنے مقامی معاملات میں مقامی زبانیں بھی استعمال کرنا ہوتی تھی۔ خواص کو عوام سے مخاطب ہونے کے لیے مقامی سطح کے بعض الفاظ اپنانے پڑتے تھے، اس سے بتدریج اردو زبان کا آغاز ہوا اور بڑھتے بڑھتے مستقل اور معتبر زبان کی حیثیت سے ملک کے مرکزی اور جنوبی علاقوں میں پھیلتی چلی گئی۔

آغاز کے لیے بعض حضرات کی تحقیق علاقۂ سندھ کی ہے جہاں عرب پہلے پہونچے۔ بعض کی تحقیق پنجاب کی اور بعض کی جنوبی ہند یعنی دکن کی ہے۔ اور یہ تحقیق زیادہ تائید رکھتی ہے۔ کم از کم اردو شاعری کے آغاز کے سلسلے میں دکن کو ترجیح حاصل ہے جیسا کہ اردو کی تاریخ کی معتبر کتابوں میں ملتا ہے۔ نیز متعدد مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ فلاں بزرگ نے فلاں جملہ استعمال کیا جو اردو زبان کے دائرے میں آتا ہے۔ فلاں شخصیت نے فلاں جملہ استعمال کیا جو اردو کا جملہ قرار پاتا ہے۔ اسی طرح شاعری کے اولین نمونے بھی دکن کے ملتے ہیں۔ اس طرح یہ زبان کئی سو سال میں برصغیر کی مروجہ زبانوں میں سے نکل کر مستقل اور معتبر زبان اور نثر وشعر دونوں میں باوقار اور کار آمد زبان بنی اور یہ عمل اب بھی جاری ہے۔

اس وقت اردو کو اس کے اصل وطن ہندوستان میں

اکثریتی لوگوں کی طرف سے یہاں کی قدیم زبان کی سوکن سمجھا جانے لگا ہے، اور اس کو وہ مقام نہیں دیا جاتا جو دیگر ملکی زبانوں کو حاصل ہے، اور اس کو صرف مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اس سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ اسی ملک میں بنی اور بڑھی، بعد میں عالمی سطح تک پہونچی۔ ضرورت ہے کہ ان کے اس ذہن کو بدلا جائے، اور اس زبان کو بھی ملکی اصلی زبان کا مقام دلایا جائے، اور اس کی جو خوبیاں ہیں، اور وطن سے اس کا جو تعلق ہے، وہ سمجھایا جائے۔ اسی کے پیشِ نظر ہمارے رابطہ ادب اسلامی نے اپنے اس ۳۶ ویں سیمینار کا موضوع ''دکن میں اردو زبان وادب کا ارتقا'' رکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اردو زبان اسی ملک کی خاک سے اٹھی، پلی بڑھی اور پروان چڑھی ہے۔ اور اس کی نشو ونما اور ترویج وترقی میں مسلم اور غیر مسلم سبھی طبقوں کا حصہ رہا ہے۔

برصغیر ہندو پاک کی گذشتہ صدیوں میں مسلمانوں کی حکومت طویل عرصے تک رہی۔ ذمہ دارانِ حکومت کے آبا و اجداد عموماً ترکستان اور خراسان کے خاندانوں سے نسبی تعلق رکھتے تھے۔ خراسان اور ایران میں عام طور پر رائج زبان فارسی تھی، اس تعلق کی بنا پر ہندوستان میں بھی اس کا استعمال سربرآوردہ اور پڑھے لکھے طبقے میں کیا جاتا رہا۔ دوسری طرف عوام میں مقامی زبانیں بھی رائج تھیں۔ اس طرح عوام وخواص یا رعیت اور حکومت کے درمیان عملی ضرورت کے پیشِ نظر واسطے کے لیے ایک درمیانی زبان کی ضرورت تھی، جو خود بخود وجود میں آئی، اور اس کو خاص طور پر ان لوگوں نے جو دونوں طبقوں کے درمیان رابطہ رکھتے تھے، اختیار کیا اور ترقی دی۔

ایک طرف صوفیا اور بزرگوں نے عوام سے اصلاح وارشاد کا رابطہ رکھنے کے لیے اختیار کیا اور دوسری طرف فوج کے افراد میں بھی اس زبان کو ذریعہ بنایا گیا۔ اس تعلق کی بنا پر یہ زبان ''اردو'' جس کے معنی ترکی زبان میں فوج کے ہوتے ہیں، اردو کہلائی۔

فوج میں تو صرف ضرورت کے لیے محدود طور پر استعمال ہوتی رہی ہوگی، لیکن صوفیائے کرام اور بزرگوں نے اس کو خاص طور پر اپنا لیا۔ اور اس طریقے سے یہ زبان عوام میں جن کا تعلق اپنے علما اور بزرگوں سے ہوتا ہے، سمجھی اور استعمال کی جانے لگی۔

صوفیائے کرام چونکہ عام طور پر علما کے طبقے سے ہی تعلق رکھتے تھے، اس لیے اس زبان کے رواج اور ترقی میں مصلحین وصوفیا کے ساتھ ساتھ علما کا کردار نمایاں رہا۔ خاص طور پر اس زبان کے علمی ثقافت اور معیار کے درجے تک پہونچنے میں علما کا خاصا حصہ رہا۔

زبان کے وجود میں آنے اور ترقی کرنے میں شاعری بھی اس کا میدانِ عمل بنی۔ اس سلسلے میں حیدرآباد خاص طور پر اس کی شاعری کا شروع کا اور اہم مرکز رہا۔ پھر بتدریج شمالی ہند میں بھی صوفیا اور مصلحین اور علما کے حلقوں میں اس زبان کو اہتمام اور خصوصیت کا درجہ حاصل ہوا۔

زبانوں کے وجود کے سلسلے میں تجربے سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس کی قوت واہمیت کا آغاز شاعری سے ہوتا ہے۔ نثر کو ظہور وطاقت اس کے بعد حاصل ہوتی ہے اور بعد میں وہ اصل بن جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ شاعری کی بھی

مقبولیت بڑھتی ہے۔ دونوں کا میدانِ عمل الگ الگ ہوتا ہے اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر زندگی کی ضرورت اور دل پسندی کا تقاضا پورا کرتی ہیں۔

جنوبی ہند کو اردو کے سلسلے میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اولین شعرا کی ابتدا میں بھی اس خطے کو اچھا دخل ہے۔ اور اردو شاعری کا جب تذکرہ ہوتا ہے تو ان کا ذکر پہلے کیا جاتا ہے۔ اردو کے دیگر علاقوں کے شعر و ادب کے عظما کا تذکرہ اس کے بعد کے عہد میں آتا ہے۔ امید ہے کہ جنوبی ہند کا اردو کے سلسلے میں جو امتیاز رہا ہے، اس پر ہمارا یہ سیمینار مفید معلومات پیش کرے گا۔

دکن کو اردو کے سلسلے میں جو خصوصیت حاصل ہوئی، وہ اردو زبان و ادب کے آغاز کے وقت وہاں کے اہلِ ذوق و اہلِ علم کی دلچسپی اور حکومتی ذمہ داروں کے طرزِ عمل کے سبب ظہور میں آئی۔ پھر اردو کو شمالی ہند میں ترقی کا موقع ملا۔ پھر اردو بتدریج ایک مکمل علمی و ادبی زبان کی حیثیت سے پلی بڑھی اور دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی فہرست میں داخل ہوگئی۔ اور دنیا کے مختلف ملکوں میں اس کو استعمال کیے جانے کا درجہ بھی ملا۔ اس کی ترقی میں دکن کی آصفیہ حکومت کی سرپرستی کا بھی خاصا دخل رہا۔ خاص طور پر حیدرآباد اس کی سرپرستی کا مرکز بنا جہاں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی اور اس کے ذریعے اردو کو علمی و تعلیمی سطح پر سرپرستی اور حکومت کی طرف سے شمالی ہند کے اردو داں اہلِ علم کی پذیرائی اور سرپرستی نے فائدہ پہنچایا۔

سلطنتِ آصفیہ نے علم پروری، معارف نوازی، حمیتِ دینی اور اہلِ کمال کی سرپرستی و قدردانی کی وہ مثال پیش کی جس کی نظیر بڑی بڑی اسلامی سلطنتوں اور عرب ملکوں کی تاریخ میں بھی ملنی مشکل ہے۔ خصوصیت کے ساتھ دائرۃ المعارف العثمانیہ (جس نے بیسیوں کی تعداد میں علما و محققینِ سلف کی ان نایاب و قلمی کتابوں کو چھاپ کر وقفِ عام کیا جن کو دیکھنے کے لیے اساتذۂ کبار کی آنکھیں ترستی تھیں)۔ دارالترجمہ (جس نے اردو زبان کو غیر ملکی زبانوں کی تحقیقات و معلومات سے مالا مال کر دیا اور جامعات میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بننے کے قابل بنا دیا)۔ نیز جامعہ عثمانیہ (عثمانیہ یونیورسٹی جس نے اردو کو پہلی مرتبہ ذریعۂ تعلیم بنایا اور دینیات کو اس کا مقام عطا کیا اور ممتاز ترین اساتذہ اور نامور علما کی تدریسی خدمات حاصل کیں) سلطنتِ آصفیہ کے اُن روشن کارناموں میں ہے جن پر صرف حیدرآباد ہی کو نہیں، مسلمانانِ ہند کو فخر ہے۔ ایک زمانے میں یہ ریاست اس برصغیر کے اہلِ کمال (بالخصوص ان مسلمان اہلِ کمال کے لیے جو برطانوی ہند میں نظرانداز کیے جا رہے تھے) کے لیے مقناطیس کا اثر رکھتی تھی۔ اور نواب محسن الملک میر مہدی علی، نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین، عماد الملک سید حسین بلگرامی، مولوی سید علی بلگرامی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا عبداللہ عمادی، عزیز مرزا اور معلوم نہیں کتنے اہلِ کمال اور عالی دماغ لوگوں کو اپنی آغوش میں جگہ دی اور ان کے ذہنی و علمی و انتظامی کمالات کو منظرِ عام پر آنے کا موقع دیا۔ جب اس سلطنت نے بیرونِ ریاست کے لائق افراد کو ان کا صحیح مقام عطا کیا تو خود اس ریاست کے مسلمان شہریوں اور باصلاحیت لوگوں کے لیے وہ قدرتاً ملجا و ماوی بلکہ آغوشِ مادری بنی ہوئی تھی۔ حکومتِ آصفیہ کی اس علم دوستی کی بڑی قدر محسوس ہوتی ہے۔ ☆☆☆

اردو زبان کی ترویج وترقی میں مدارس کا حصہ

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

اردو زبان دنیا کی دیگر زبانوں سے بہت سے امور میں مختلف ہے؛ جن میں پہلا اور بنیادی اختلاف یہ ہے کہ اردو زبان ایک جدید زبان ہے، جس کی عمر تین سو سال سے زیادہ نہیں۔ یہ مغلوں کے آخری دور میں پنپی، پھلی پھولی اور ترقی یافتہ زبان بنی۔ یہ وہ دور تھا جب ابھی اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اور ان کا کلچر ہی رائج وغالب کلچر تھا۔ دوسرا اختلاف یہ ہے کہ اس زبان نے اپنے لغوی اور فکری سرمایے میں ترکی، فارسی، عربی، ہندی اور سنسکرت جیسی دیگر زبانوں سے کافی مدد لی ہے، اور ان زبانوں کے الفاظ حسب ضرورت اس میں منتقل ہوئے اور ان سب کے اختلاط وآمیزش سے اردو زبان عالمِ وجود میں آئی، اس کی کتابت میں فارسی رسم الخط اختیار کیا گیا، پھر دوسری زبانوں سے منتقل ہونے والے الفاظ اردو میں آکر ہندوستانی ماحول میں ڈھل گیے اور انہوں نے ہندوستانی لب ولہجہ اور اسلوب اختیار کر لیا اور ان پر یہاں کا مقامی رنگ چڑھ گیا۔

اردو زبان مسلمانوں کے دورِ عروج وعہدِ قوت واقتدار میں اور اسلامی ماحول کی برتری وبالادستی کی فضا میں پروان چڑھی، خاص طور پر شمالی ہند اور دکن کی اسلامی ریاستوں میں اس کو زیادہ برگ وبار حاصل ہوا، جس کے نتیجے میں اس زبان پر اسلامی رنگ پختہ ہوا اور اس پر اسلامی ثقافت کی چھاپ پڑی، اور اسلامی تعبیرات واصطلاحات زبان کے بنیادی اجزا قرار پائے۔ مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ اپنی کتاب ''اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں'' میں اردو زبان کی پیدائش اور نشوونما کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''ہندوستان کی اصل زبان سنسکرت ہے، اور ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق اس زبان میں ان کی چار آسمانی اور مقدس کتابیں ہیں لیکن روزمرہ اور عام بول چال کی زبان دوسری ہے، جو ہندوستان کے بڑے حصے میں بولی جاتی ہے اور اس کو ''بھاشا'' زبان کہتے ہیں، جب ہندوستان میں اسلام کی اشاعت ہوئی اور عرب وعجم سے یہاں مسلمانوں کی آمد ہوئی تو عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبانوں کے اختلاف وآمیزش سے ایک نئی زبان پیدا ہوئی اور اس کو ''اردو'' کہا جاتا ہے، یہ زبان بتدریج ترقی کرتی رہی، یہاں تک کہ شاہ جہاں کے زمانے میں یہ فصاحت وبلاغت کے اچھے

معیار پر پہنچ گئی۔ ابتدا میں دہلی اور اس کے اطراف کے لوگوں کا میلان فارسی شاعری کی طرف تھا، اور اردو شاعری میں شعر گوئی کا رجحان نہیں تھا، بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ کو موسیقی اور ہندی زبان سے بہت گہرا تعلق تھا، اور اس نے ہندی زبان میں کچھ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں، اس کے پاس اس کے زمانے کے علوم و معارف کا بڑا حصہ جمع ہو گیا تھا، اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، یہ حالت ابراہیم عادل شاہ کے لڑکے محمد عادل شاہ اور پھر ان کے لڑکے علی عادل شاہ کے زمانے تک قائم رہی، علی عادل شاہ کو اردو زبان سے بڑی دلچسپی تھی، اس لیے اس کے زمانے میں لوگ اس زبان کی طرف زیادہ مائل ہوئے اور اس زبان میں اشعار کہنا شروع کیا"۔

اور محمد حسین آزاد "آب حیات" میں اردو کی ابتدائی تاریخ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"ادھر تو یہ چونچال لڑکا (اردو) شعرا کے جلسوں میں اور امرا کے درباروں میں اپنی بچپنی کی شوخیوں سے سب کے دل بہلا رہا تھا، ادھر دانائے فرنگ جو کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعے پر دوربین لگائے بیٹھا تھا، اس نے دیکھا، نظر باز تاڑ گیا کہ لڑکا ہونہار ہے، مگر تربیت چاہتا ہے، تجویز ہوئی کہ جس ملک پر حکمرانی کرتے ہیں اس کی زبان سیکھنی واجب ہے، چنانچہ ۱۷۹۹ء (۱۲۱۴ھ) میں میر شیر علی افسوس نے "باغ اردو" اور ۱۸۰۵ء (۱۲۲۰ھ) میں "آرائشِ محفل" لکھی، میر امن دہلوی نے ۱۸۰۲ء (۱۲۱۷ھ) میں "باغ و بہار" آراستہ کیا، اور انہی دنوں میں "اخلاق محسنی" کا ترجمہ لکھا، ساتھ ہی جان گلکرسٹ صاحب نے انگریزی میں "قواعد اردو لکھی"۔.....اب عام فہم اردو ہو کر ناگری میں لکھی گئی، لیکن اس نقارۂ فخر کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا کہ میر انشاء اللہ خاں پہلے شخص ہیں جنہوں نے ۱۸۰۷ء (۱۲۲۲ھ) میں قواعدِ اردو لکھ کر ایجاد کی ٹہنی میں ظرافت کے پھول کھلائے"۔

آگے مزید لکھتے ہیں:

"عجیب لطف یہ ہے کہ زبانِ اردو کی عام فہمی دیکھ کر مذہب نے بھی اپنی برکت کا ہاتھ اس کے سر پر رکھا، یعنی ۱۸۰۷ء - ۱۲۲۲ھ میں مولوی شاہ عبدالقادر صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ اردو میں، بعد اس کے مولوی اسماعیل صاحب نے بھی بعض رسالے عام اہلِ اسلام کی فہمائش کے لیے اردو میں لکھے"۔

"۱۸۳۵ء سے دفاترِ سرکاری بھی اردو ہونے شروع ہوئے، چند سال کے بعد کل دفتروں میں اردو زبان ہو گئی، اسی سنہ میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی، ۱۸۳۶ء میں اردو کا اخبار دلی میں جاری ہوا اور یہ اس زبان میں پہلا اخبار تھا.....اور ۱۸۴۲ء سے دلی میں سوسائٹی قائم ہو کر ترجمے ہونے لگے"۔

(آب حیات صفحہ: ۲۴-۲۵)

محمد اکرم صاحب لکھتے ہیں:

"ان کی (یعنی مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی)

اہم ترین کتاب ''تقویۃ الایمان'' ہے، جوانہوں نے اردو زبان میں اس وقت لکھی جب اس زبان کو ابھی گھٹنوں چلنا نہیں آتا تھا، حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں جب اردو نثر میں گنتی کی کتابیں تھیں، ایک صاحبِ کمال نے اس میں کیا جادو بھر دیا ہے، اور اس کی مدد سے اپنے خیالات کو کتنی خوبی سے ادا کیا ہے''۔ (موج کوثر صفحہ:۳۸)

اردو زبان کا تخم پہلے اسلامی لشکر کی زمین میں بویا گیا، پھر اس کی نشو ونما دہلی اور دکن کے اسلامی شاہی درباروں میں ہوئی، پھر اس کو رائج وعام فہم اور مقبول بنانے میں مصلحینِ امت، علمائے ربانیین اور ان کے شاگردوں اور مریدوں نے حصہ لیا، اور اسلامی موضوعات پر نثر ونظم کی اولین کتابیں اسی زبان میں لکھی گئیں۔

اردو انسائیکلوپیڈیا میں لفظ اردو کی تشریح میں تحریر ہے کہ:

''ابتدائی کتابیں جو اردو زبان میں لکھی گئیں، ان میں معراج العاشقین، شرح مرغوب المطلوب، شرح تمہید ہمدانی اور قرآن شریف کے ترجمے کی کتابیں ہیں''۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے معلوم ہوا کہ علما نے جن کا تعلق مدارسِ دینیہ سے ہے، اردو زبان کی ترقی وترویج میں اہم کردار ادا کیا ہے، انہوں نے اپنے مواعظ، دینی رسائل، اور دینی واسلامی احکامات وتعلیمات پر مشتمل کتابوں کے ذریعے سے اردو زبان کو فروغ دیا۔

اردو نثر کی طرح اردو شاعری بھی اہلِ دل صوفیہ اور بزرگانِ دین کی گود میں پلی بڑھی، چنانچہ اردو شاعری پر امیر خسرو، مرزا مظہر جانِ جاناں کے اثرات سے تاریخِ ادبِ اردو سے واقفیت رکھنے والا انکار نہیں کرسکتا، حکیم مومن خاں مومنؔ اور خواجہ میر دردؔ کا کلام بھی درد وسوز اور رقت وگداز کا شاہکار ہے، یہ دونوں حضرات علما وصوفیہ اور بزرگان دین کے عقیدت مند وارادت کیش اور اسلامی جذبے کے حامل شاعر تھے، خواجہ میر دردؔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں، ''اسرار الصلاۃ'' ان کا ایک رسالہ ہے جو پندرہ برس کے سن میں لکھا ہے، ''واردات دردؔ'' نامی ایک دوسری کتاب ہے جس میں ایک سو گیارہ رسالے ہیں ''نالۂ دردؔ'' ''آہِ سرد'' ''دردِ دل'' ''سوزِ دل'' اور ''شمعِ محفل'' وغیرہ۔ اس کی شرح میں ''علم الکتاب'' جیسی کتاب تصنیف کی، ایک رسالہ مبحث غنا میں لکھا ہے، ایک دیوان فارسی میں ہے اور ایک ریختہ میں۔ یہ ساری کتابیں مطبوعہ ہیں اور حکیم مومن خاں مومنؔ جوانی میں سید احمد شہیدؒ کے مرید ہوئے اور آخر عمر تک عقائد میں انہی کے پیرو متبع رہے، کلیات میں ایک مثنوی جہاد یہ ہے جو اس وقت لکھی تھی جب سید صاحب سکھوں سے جہاد کررہے تھے، علاوہ اس کے دو قطعۂ تاریخ ان کی امامت کے ہیں۔ شوقِ شہادت پر ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے:

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

اردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں اور اسے آسان وعام فہم بنانے میں فکرِ اسلامی اور حاملینِ فکرِ اسلامی وعلم برادرانِ دعوتِ اسلامی کے اثرات کا اعتراف تاریخ ادب اردو کے مؤرخ رام بابو سکسینہ نے بھی کیا ہے، اور یہ سب مدارس کے فیض یافتہ ہیں، ان کی کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ مرزا حسن عسکری

نے ۱۹۲۵ء میں کیا، یہ کتاب اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم مرجع شمار ہوتی ہے، مؤلف کتاب کہتے ہیں:

''مولوی اسماعیل صاحب کا مشہور رسالہ تقویۃ الایمان اور نیز دیگر مریدان مولوی سید احمد کی تصانیف مثلاً **ترغیب جہاد، ہدایۃ المؤمنین، نصیحۃ المؤمنین (أو المسلمین) موضح الکبائر والبدعات، مأۃ مسائل** وغیرہ، ان سب سے اردو زبان کو بھی ضرور تقویت پہنچی''۔

آگے لکھتے ہیں:

''اس کے علاوہ ادب اردو کے تاریخ نگار مستشرق گارساں دتاسی کے مطابق وہ اثرات بھی سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے حق ہی میں جائیں گے جس سے مسلمان فرقوں کی تصانیف مثلاً (۱) سید احمدیوں۔ (۲) ہندوستانی وہابیوں۔ (۳) روشنائیوں، وجود میں آئیں، نیز سید احمد شہید کے دوبارہ ظہور پذیر ہونے پر رسالے لکھے گئے''۔

ان تصنیفات نے اردو نثر کی گردن سے جو تکلفات سے گراں بار تھی، تصنع، تکلف، تبحیج وابہام کا قلادہ اتار پھینکا، اور اس کی جگہ صاف گوئی، جرأت، بیباکی، سادگی وسلاست کا ہار پہنایا، جس پر سید احمد شہیدؒ کے رفقا کی نثر نگاری کی بنیاد قائم ہے۔

علما جن کا تعلق مدارسِ اسلامیہ دینیہ سے ہے، ان کا اردو زبان کی ترویج وترقی میں حصہ ناقابل فراموش ہے، انہوں نے نصاب کی کتابیں اردو زبان میں تیار کیں، جو پورے برصغیر میں عام ہوگئیں، پھر ان کی شروحات اور کتب تفسیر وحدیث کی تشریح وتوضیح اردو میں انجام پائی، دینی احکامات اور اسلامی تعلیمات عام فہم اور آسان اردو زبان میں پیش کی گئیں، اس طرح اردو زبان کا دائرہ وسیع ہوا، اس کی مثال مولانا اشرف علی تھانوی اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی تصنیفات ہیں جو گھر گھر پہنچ گئیں، مولانا اشرف علی تھانوی کی بہشتی زیور اور مولانا زکریا کاندھلوی کی فضائلِ اعمال پر لکھی گئی کتابیں اس کا بین ثبوت ہیں۔

اسی طرح علمی، فکری، تحقیقی، تمدنی اور دعوتی موضوعات پر علماء کرام نے اردو میں کتابیں لکھیں جن سے اردو زبان کے اعتبار ووقار میں اضافہ ہوا اور عالمی سطح پر فروغ حاصل ہوا، مولانا محمد علی مونگیری، علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الباری ندوی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور دیگر فضلائے ندوہ کی علمی، فکری اور دعوتی تصنیفات اردو میں مقبول خاص وعام ہیں۔ دارالمصنفین اعظم گڈھ نے اردو زبان وادب کی جو بیش بہا خدمت انجام دی ہے اس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا، اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ دارالمصنفین کے منتسبین مدارس کے فیض یافتہ وپروردہ ہیں۔ اسی طرح ندوۃ المصنفین دہلی کا بھی اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں اہم کردار رہا ہے جس کے ذمہ داروں کا انتساب مدرسے سے ہے۔

اردو زبان کی ترویج وترقی میں مدارس سے نکلنے رسائل ومجلات کا بھی اہم رول ہے جو بڑی تعداد میں نکل رہے ہیں اور یہ ادبی حلقوں سے شائع ہونے والے مجلات ورسائل سے مواد، اسلوبِ نگارش اور ادبیت میں کم نہیں، رسالوں اور اخباروں میں لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد سید احمد شہیدؒ کی جماعتِ مجاہدین، اور دینی جذبے کے حامل علما کی طرف منسوب رہی ہے، دارالعلوم

دیوبند، ندوۃ العلماء، مظاہر العلوم، مدرسۃ الفلاح، مدرسۃ الاصلاح اور دیگر مدارس کے افراد کا اس میں نمایاں حصہ ہے اور اس میدان میں دبستانِ سید احمد خاں اور ان کے مدرسۃ العلوم سے متعلق افراد بھی شریک ہیں۔

اس میدان میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبد الماجد دریابادی اور علامہ سید سلیمان ندوی کے نام سرفہرست ہیں، جو اپنے پرجوش ادب، سیال ورواں قلم، اپنی ادبی تحریروں اور دلچسپ اسلوب کے لیے مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ بھی علما کی ایک طویل فہرست ہے جو اپنے اپنے دور میں مستند اور باوقار مجلات ورسائل کے ایڈیٹر رہے اور اردو زبان وادب کی خدمت کی۔

اگر ہم اردو زبان وادب کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ناول، افسانہ، ڈرامہ، قصہ اور تاریخ میں اسلامی جذبہ اور دینی وتربیتی عناصر کا کتنا غلبہ ہے، اور ہم دیکھیں گے کہ ادبا نے ان ادبی اصناف میں بھی اسلامی مسائل اور مسلمانوں کی زندگی کی مشکلات پیش کی ہیں، اور تاریخ اسلامی کی فتح مندیوں اور کامرانیوں کے ساتھ ساتھ اس کی شکستوں اور ہزیمتوں اور اسلامی تاریخ کے پردرد وپراثر واقعات پر بھی کتابیں لکھی گئی ہیں، اسی طرح بہت سے ادبا نے اسلامی زندگی کی مشکلات اور اسلامی معاشرہ کی راہ میں حائل دشواریوں کو بھی اصلاح کی غرض سے اپنے ناولوں اور قصوں میں جگہ دی ہے، مثلاً عبدالحلیم شرر کہ ان کا مؤثر واقعات اور داستانوں کا ایک طویل سلسلہ ہے، جن میں انہوں نے زیادہ تر مصائب ومشکلات کی تصویر کشی کی ہے، اور ان کی اس طرح کی کتابوں کو بڑی مقبولیت ملی اور شہرتِ دوام حاصل ہوئی۔

اردو میں تاریخ کی کتابوں نے بھی اسلامی غیرت وحمیت کو مہمیز دینے اور اخلاف کا تعلق اسلاف سے استوار کرنے میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے جو تاریخ کا وظیفہ ہے، انگریزی سامراج چاہتا تھا کہ امت کا تعلق اس کے ماضی سے کاٹ دے اور غلط سلط تاریخ پیش کرکے نئی تعلیم یافتہ نسل کے ذہنوں میں شکوک وشبہات کا بیج بودے، لیکن آفریں ہے اردو تاریخ نویسوں پر کہ انہوں نے ماضی پر ان کا اعتماد بحال کیا اور ان کے آباء واجداد نے سیاست، علم، ادب اور فن کے میدانوں میں جو جرأت مندانہ کارنامے انجام دیے تھے ان کی عظمت وتقدیس ان کے دلوں میں پیدا کی، ان مؤرخین کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کا اسلامی جذبہ نیز اسلامی رنگ اور قابلِ عبرت وموعظت باتوں کو نمایاں کرنے کی ان کی کوشش موضوع کے ساتھ انصاف کرنے سے مانع نہیں ہوتی تھی، چنانچہ وہ لائقِ عبرت باتوں کی طرف توجہ بھی دلاتے تھے لیکن اس کے باوجود تاریخی پیشکش میں کوتاہی نہیں کرتے تھے، اور اپنے موضوع سے ہم آہنگ یہ تاریخ اپنے جذباتی ومؤثر اسلوب کے نتیجے میں ایک دلآویز ادبی موضوع بن جاتی، اس کے نتیجے میں قاری عالمی اسلوب سے قریب تر آسان تاریخی اسلوب کی پیشکش سے جذبات کی عکاسی اور قلبی ووجدانی جوش کی طرف منتقل ہوتا جو دلوں کو حیرت زدہ کردیتا اور جو وجدانی ادب سے قریب تر ہوتا تھا۔

اس اسلوب کے بہترین نمائندے مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ اور علامہ شبلی نعمانیؒ تھے، جن کا تعلق مدرسے سے ہے، قاری ان کی تاریخی تحریروں میں ایسے شاہکار ٹکڑے پاتا ہے جو اپنی تاثیر ودلآویزی میں کسی فنی نثری ٹکڑے سے کم نہیں ہیں، بلکہ بعض مرتبہ وہ نثری شاعری کے ٹکڑے معلوم ہوتے ہیں، اور یہ رنگ

سفرناموں، سیرت وسوانح، ملکوں کی تاریخ اور اسلامی ثقافت کی تاریخ نیز دیگر اقسام میں ظاہر ہوتا ہے۔

مولانا سید عبدالحی حسنیؒ صاحب "**نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر**" ۱۸۹۴ء میں یعنی ہندوستان پر انگریزوں کے قبضے کے تقریباً پچاس سال بعد دہلی، سہارنپور اور اطراف کے اسلامی آثار، علمی اسلامی مراکز اور علماء وبزرگانِ دین کی زیارت کو نکلے، اور اپنے سفر کے تأثرات اور یادداشتیں ان کے بے پناہ بلکہ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے اسلامی جذبے کی عکاسی کرتی ہیں، اور ان کے بعض مقامات قاری کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کردیتے ہیں، جب وہ اپنے دردمند قلم اور زخمی دل سے اسلامی آثار کی کہنگی وبے بسی اور ان کی خستہ حالی کا تذکرہ کرتے ہیں، اور یہ بتاتے ہیں کہ سیاسی انقلاب نے ان میں کیا تبدیلیاں کیں اور ان کو کیا سے کیا بنادیا، لیکن اب بھی وہ شاندار دور کی یاد دلاتے ہیں۔

لال قلعہ کی سیر کے وقت ان کا یہ جذبہ چھلک پڑتا ہے اور وہ کہتے ہیں:

> ''ہم مسجد سے براہ راست قلعہ گیے، یہ قلعہ بالکل سنگِ سرخ کا بنا ہوا ہے، اپنی لطافت اور سبکی میں بے نظیر ہے، دروازے پر ایک گورا ٹہل رہا تھا، اس نے ٹکٹ لے لیا، اور ہم اندر روانہ ہوئے، قلعے کے اندر جانے کے بعد متعدد دروازے اور ڈیوڑھیاں مسلسل ملتی ہیں، ان میں اب آج کل گورا بازار ہے، اس سے نکل کر پھر بالکل ویران اور غیر آباد ہے، کہیں کہیں انگریزی عمارتیں اور بارکیں بنی ہوئی ہیں، شاہی عمارتیں بالکل

متاصل کردی گئی ہیں، ان کے نشانات اب صرف دربارِ عام کے ایک درجہ سے اور دربارِ خاص وحمام ومسجد وثمن برج سے معلوم ہوتے ہیں، جن کے دیکھنے سے ایسی عبرت ورقت ہوتی ہے جو کسی طرح بیان میں نہیں آسکتی۔ سبحان اللہ! یہ وہ مکانات ہیں جن میں ہر کس وناکس کے پہنچنے کی مجال نہ تھی، بڑے بڑے امراء ہفت ہزاری وپنج ہزاری دربارِ عام تک پہنچنے کو فخر وسعادت سمجھتے تھے، وہی تخت جس کے سامنے درباری عہدِ اکبری وجہانگیری میں سجدہ کرتے تھے، اور درباری شاہجہانی وعالم گیری میں اس کے پائے کو بوسہ دینے کو فخر سمجھتے تھے، آج ادنی ادنی گورا جوتہ پہنے ہوئے اسی کو روندتا ہے۔ **فاعتبروا يا أولي الأبصار. الملك لله، والأمر لله، والأرض لله، يورثها من يشاء.**

مجھ کو معاف کیجئے گا، ان مکانوں کے دیکھنے سے میرا دل ایسا بے قابو ہے کہ میں ان کے حالات بیان کرنے سے بھی قاصر ہوں، بلکہ جو شخص ان درباروں کی ہسٹری اور قلعہ کی جاگرفی سے ماہر ہے وہ کیا ممکن ہے کہ ان کو دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو نہ روئے، اس کا دل بے چین نہ ہوجائے، اس کے بدن پر رونگٹے نہ کھڑے ہوجاویں، اس کی آنکھوں کے سامنے خدا کی سچی عظمت وہیبت نمودار نہ ہوجائے، دنیا کے فانی ہونے کا پردہ نہ اٹھ جائے، ذرا تھوڑی دیر کے واسطے آپ حدیقۃ الاقالیم میں محمد شاہی دربار کا سماں دیکھ

لیجئے، پھر عالم شاہی دربار کا تنزل ملاحظہ فرمایئے، پھر ان ٹوٹی پھوٹی دیواروں میں کرّ وفر شاہی کے آثار دیکھئے۔ **الله الله، ولا موجود إلا الله.**

اب نہ وہ زمانہ ہے، نہ وہ لوگ ہیں، نہ بادشاہ ہیں، نہ ان کے درباری، یہ ٹوٹی پھوٹی عمارتیں باقی ہیں، جو زبان حال سے مسلمانوں کے اقبال وادبار، ترقی وتنزلی کو بیان کررہی ہیں، بڑا سنگ دل ہے وہ شخص جو ان کو دیکھ کر نہ رواٹھے، بڑا قاسی القلب ہے وہ مرد جو ان کو دیکھ کر متأثر نہ ہو، بڑا بے حمیت ہے وہ مسلمان جو مسلمانوں کے اقبال وادبار کی ان حقیقی تصویروں کو دیکھ کر خاموش رہے، بڑا بے غیرت ہے وہ نیچری جو کارخانۂ قدرت کی ان نیرنگیوں کو دیکھ کر اپنے عقیدے پر نادم نہ ہو۔

کیا یہ وہی دربارِ خاص ہے جن میں بڑے بڑے سلاطینِ ہند علی قدر مراتب کھڑے ہونے کو فخر سمجھتے تھے، کیا یہ وہی تخت ہے جس کے سامنے بڑے بڑے مہاراجہ سر جھکانے کو اپنا دین وایمان جانتے تھے، یہ سب کارخانۂ قدرت کی نیرنگیاں ہیں، فانی ہے اور زائل تمام کائنات۔ اور باقی ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں تمام عالم کی موت وحیات ہے، جس کی قدرت اور بقا پر عالم کے نشیب وفراز، گرم وسرد، تلخ وشیریں، تغیرات وحوادث بآواز بلند گواہی دے رہے ہیں، ﴿ **كل شيء هالك إلا وجهه** ﴾ .

مؤرخ کا قلم رکتا نہیں ؛ بلکہ وہ ان آثار کی مزید تصویر کشی کرتا جارہا ہے اور اپنے رنج وغم کا اظہار پردرد اسلوب میں کررہا ہے، ادھر قاری کا حال یہ ہے کہ وہ ہر جملے پر رکتا ہے، آہِ سرد کھینچتا ہے اور جب اس کے غم کو ذرا سکون ملتا ہے تو آگے بڑھتا ہے۔

جس کو بھی بشمول عربی زبان دوسری زبانوں سے واقفیت ہے، وہ اردو زبان کی اس خصوصیت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس کی پیدائش اور نشو ونما صلحائے امت اور علمائے دین، دعوت واصلاح اور تعلیم وتربیت کا کام کرنے والے داعیوں کی گود میں ہوئی، ان ہی کے زیر سایہ پلی بڑھی، اور برگ وبار لائی، ان حضرات کا زبان وادب کا رخ متعین کرنے اور اس کو ترقی دینے میں اہم کردار ہے اور اس سلسلے میں ان کے پائدار اور انمٹ نقوش وآثار ہیں جن کا اعتراف تاریخ ادب اور نقدِ ادب کے محققین اور ماہرین کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی تنظیموں اور تحریکوں کے قائدین کے لٹریچر کا بھی بنیادی کردار ہے، دعوتی اور اصلاحی مقصد سے جو لٹریچر مختلف عہدوں میں شائع ہوتا رہا، اس کی وجہ سے بھی اردو زبان کی ترقی ہوتی رہی اور یہ عنصر اس کی بقا کا ضامن ہے، اس کی وجہ سے اردو شمالی ہند سے نکل کر جنوبی ہند کے مختلف علاقوں میں پھیلتی رہی، وہ اب شمالی ہند کی زبان نہیں ہے، بلکہ جنوب ومشرق میں اس کے سمجھنے والے پائے جاتے ہیں، اور اس میں بھی اہم رول مدارس کا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆

☆☆☆

اُردو رسم الخط اور خوش نویسی کے تحفظ وفروغ میں مدارسِ اسلامیہ کا حصہ

ڈاکٹر شکیل احمد
قاسمی منزل، مئوناتھ بھنجن، یوپی

کوئی زبان جب تک بولنے اور سمجھنے تک محدود رہتی ہے، بولی کہلاتی ہے۔ زبان کا درجہ پانے کے لیے اس کے لکھنے اور پڑھنے کے وسائل نیز لکھنے کے لیے حروفِ تہجی، رسم الخط اور تحریر کرنے کے طریقے اور ضابطے کی ضرورت ہوتی ہے۔ رسم الخط کے بغیر زبان کا وجود ممکن نہیں۔ اردو کا رسم الخط فارسی کا ہی رسم الخط ہے۔ حروفِ تہجی میں بہت معمولی سا فرق ہے۔ اُردو اپنے ابتدائی دور میں بولی کے مرحلے میں ضرور تھی لیکن فارسی سے مماثلت کے باعث لکھنے اور پڑھنے کی منزل تک پہنچتے دیر نہیں لگی۔ اس کی تعلیم کا سلسلہ گھریلو درس گاہوں، مدرسوں اور مکاتب کی شکل میں قائم ہوا۔ شاعری اور نثر میں مافی الضمیر کی ادائی کا آغاز ہوتے ہی یہ ملک کے بڑے خطے میں لکھی اور پڑھی جانے لگی۔ اس کے عروض وقواعد بھی طے پا گیے۔ شاعروں اور ادیبوں نے اپنی نگارشات سے اس کے دامن کو وسعت دینے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔

مختلف لسانی گروہوں، اہلِ علم اور اہلِ ثروت کی سرپرستی کے ساتھ ملک کے مختلف طبقات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا ذریعہ بھی بنی اور بہت کم مدت میں پورے ہندستان میں بول چال، لکھنے پڑھنے اور اہلِ قلم کی زبان بن گئی۔ اُردو زبان کا رسم الخط ذرا کفایتی بھی ہے، کم جگہ اور کم وقت میں تیز رفتاری سے لکھا جانا، اس رسم الخط کا خاص وصف ہے۔ اب رسم الخط میں بڑا تنوع ہے۔ نستعلیق سب سے زیادہ مستعمل ہے۔ مگر اس کے لکھنے کے ہزار انداز کاتبوں اور خوش نویسوں نے ایجاد کر رکھے ہیں۔ جس کی بدولت اس کی تحریر میں دل کشی اور رعنائی بھی خوب جھلکتی ہے۔ جب تک پریس کا چلن نہیں ہوا تھا، قلمی نسخوں کی شکل میں کتابیں اور رسائل ترتیب دیئے جاتے تھے۔ پریس آنے کے ساتھ اس کی اشاعت میں تیز رفتاری آ گئی۔ جب جرائد وکتب کی اشاعت آسان ہوئی تو اس کے فروغ کی راہیں بھی وسیع ہوتی چلی گئیں۔ بولی سے زبان بننے اور عصرِ حاضر کی بین الاقوامی زبان کی صف میں کھڑے ہو جانے کے لائق بننے تک اس کی نشو ونما اور فروغ میں علما، صوفیا، مصلحین، مبلغین، اساتذہ اور مدارس نے سب سے زیادہ حصہ لیا۔ اس زبان کی شناخت مدارس، خانقاہ، علما اور صوفیا سے ضرور ہوئی مگر وقت کے ساتھ انتظامِ حکومت چلانے کے قابل بنانے میں دیگر طبقات کے دانش وروں اور ماہرینِ فن نے بھی اس کی ترقی کے لیے بہت جد وجہد کی۔ خوش نویسی اور خطاطی کی تعلیم وتربیت اور مہارت کا مدارسِ اسلامیہ ہی اصل مرکز رہے ہیں۔ یہیں کے تربیت یافتگان نے انفرادی طور پر اس فن کی ترقی اور فروغ کے کام بھی کیے۔ بہت بعد میں بعض صوبائی

اور ملکی اکیڈمیوں میں بھی تربیت کے مراکز قائم ہوئے مگر ان کی کارکردگی اکادمیوں کی مجموعی کارگزاری کا ہی نمونہ رہی ہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد جب اُردو زبان وادب کے لیے پورے ملک اور خاص طور پر شمالی ہند کی زمین تنگ ہوتی گئی اور سرکاری دفاتر میں اس کا چلن اور سرکاری اسکولوں میں اس کی تعلیم کا سلسلہ تقریباً بند کر دیا گیا، اس وقت یہی مدارس تھے جہاں اُردو کی تعلیم ماضی کی طرح نہ صرف جاری رہی بلکہ ترقی پذیر بھی رہی۔ آج بھی مدارس میں ماضی کی طرح اُردو تعلیم اور خوش نویسی پر پوری توجہ اور محنت صرف کی جاتی ہے۔

آج کچھ سرکاری اسکولوں اور پرائیویٹ مسلم زیرِ انتظام اسکولوں میں اُردو کی جو تعلیم دی جاتی ہے، اس کا معیار مدارس کی تعلیم سے کمتر ہوتا ہے۔ دوسرا بڑا فرق خوش نویسی کا ہے۔ مدارس میں آج بھی قلم دوات کی مدد سے تختی یا کاپی لکھنے کا سلسلہ قائم ہے، جب کہ اسکولوں سے یہ چیز تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ چوں کہ مدرسے کا ذریعۂ تعلیم اُردو ہوتا ہے، اس لیے اُردو کی نوک پلک درست کرنے کا عمل بھی یہیں پر بہتر ہوتا ہے۔ خوش نویسی کے ساتھ الفاظ کے مخرج، ادائی تلفظ اور مطلب ومفہوم کے سلسلے میں بھی یہ مدرسے پیش پیش رہتے ہیں۔

کمپیوٹر کی آمد کے بعد اگرچہ خطاطی اور خوش نویسی کے ماہرین متاثر ہوئے ہیں، لیکن کمپیوٹر اسکرین پر انھیں کے فن جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس فن میں نام پیدا کرنے والوں میں مدارس کے تربیت یافتگان ہی سرِ فہرست رہے ہیں۔ جب سے اُردو پریس نے کام کرنا شروع کیا، کاتب حضرات کی بدولت خوش نویسی کے سہارے کتابوں کی اشاعت کا بہتر سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ چند برس قبل تک اخبارات وجرائد اور کتابیں ہر ایک کی اشاعت کاتب حضرات کی محتاج ہوا کرتی تھی۔ کمپیوٹر کی آمد کے ساتھ بہت سے خوش نویسوں نے قلم کے بجائے کی بورڈ سنبھال کر اسکرین پر نظریں جمائیں۔ مدارس کے طلبہ نے بہت بڑی تعداد میں نئی تکنیک کا فائدہ اٹھایا اور کمپیوٹر کے ذریعے کتابت کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ یہاں بھی ماشاءاللہ مدارس کے طلبہ ہی سرِ فہرست ہیں۔

مدارس میں زیرِ تعلیم بچے ہوں یا اعلیٰ درجات کے طلبہ، خوش نویسی، املا کی درستی ان کا خاص وصف ہوتا ہے۔ بہت معمولی تعداد خوش نویسی سے محروم رہ جاتی ہے۔ مگر اس کے برعکس جن طلبہ نے کبھی مدرسے کا رخ نہیں کیا، اسکول سے اُردو شناسی اور لکھنے کی مشق کا آغاز کیا، ان میں سے بہت کم تعداد خوش نویس نکلتی ہے، ورنہ اکثریت بدخطی کا شکار ہوتی ہے۔ اس کا مشاہدہ اُردو اخبارات و رسائل کے دفاتر، مدیر حضرات کی فائلوں، مشاعرے کے کنوینر صاحب کی شعرا سے مراسلت کے ریکارڈ، یونی ورسٹی کے اُردو شعبے سے متعلق ایم اے اور ریسرچ اسکالرس کی تحریروں سے کر سکتے ہیں۔ یہاں بعض حضرات کی اُردو تحریر پڑھنے میں آپ کو پسینہ بھی آسکتا ہے۔ اس کا دیدار آپ ''سہارا'' اخبار میں شگفتہ خالدی کے کارٹون کی اُردو تحریر میں آئے دن کرتے رہتے ہیں۔ اگر سید حامد، سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور پروفیسر قمر رئیس جیسے بہت سارے حضرات نے اُردو لکھنا پڑھنا کسی مدرسے سے شروع کیا ہوتا تو یقیناً ان کا خط بھی ضرور خوب صورت ہوتا۔ اگر آپ کو خوب صورت تحریر اور خوش نویسی دیکھنا ہو تو کسی بھی مدرسے میں چلے جائیے ان شاءاللہ آپ کو اس ادارے میں موجود طلبہ اور اساتذہ ہر ایک کا خط آپ کو ضرور متاثر کرے گا۔ مجھے تو امید ہے کہ آپ یہاں بدخطی دیکھنے کو ترس جائیں گے۔

اُردو رسم الخط کی تبدیلی کی جو آوازیں گزشتہ ساٹھ ستر سال سے کبھی کبھی اٹھا کرتی ہیں، ان میں کوئی آواز مدرسے سے کبھی نہیں اٹھتی۔ یہی نہیں اُردو رسم الخط کے تحفظ اور فروغ میں اہلِ مدارس ہی پیش پیش رہے ہیں اور موقع پرستوں اور بے وفاؤں کو انھیں حضرات سے بھرپور جواب بھی ملا ہے۔ رسم الخط کی تبدیلی سے اُردو زبان کا کیا حشر ہوسکتا ہے، اس خطرے سے اہلِ مدارس نے ہمیشہ خبردار کیا ہے۔ آج بھی انھیں مدرسوں کے محبانِ اُردو، اس کے دفاع اور تحفظ کے لیے پہلی صف میں نظر آتے ہیں۔ مگر ستم ظریفی دیکھیے کہ جن حضرات نے اُردو کی ہمیشہ بے لوث خدمت کی، آج بھی ہر قدم پر اُردو کے لیے قربانی پیش کرنے کو تیار رہتے ہیں، جو اُردو کتابوں کے سب سے بڑے خریدار ہوتے ہیں، جو سب سے خوب صورت اور دل کش اُردو لکھتے ہیں، جو بہت معمولی مشاہرے پر بہت معیاری اُردو پڑھاتے اور درست املا لکھنے کی مشق کراتے ہیں، جو پورے ہندستان میں اُردو مخالفوں کے سامنے ہمیشہ سینہ سپر رہتے ہیں، انھیں حضرات اور انھیں اداروں کا جی بھر کر استحصال بھی ہوتا ہے۔ اُردو سے متعلق صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے زیرِ سرپرستی چلنے والے اداروں میں چند فیصد کی نمائندگی بھی مدارس یا یہاں کے اساتذہ کی نہیں ہوتی، جو بیشتر یونیورسٹیوں کے شعبۂ اُردو کو سب سے اچھے طلبہ وطالبات اور اسکالر مہیا کرتے ہیں۔

آج بہت بڑا سوال ہے کہ کیا اُردو صرف اعلیٰ معیارِ تحقیق کی بدولت زندہ ہے یا اپنی بنیادی تعلیم اور مدارس کی شکل میں پورے ملک میں پھیلے ہوئے اُس نیٹ ورک کی بدولت زندہ ہے جہاں سے اُردو کے اچھے اور خوش نویس طالبِ علم پیدا ہوکر یونی ورسٹیوں اور کالجوں کے شعبۂ اُردو کو توانائی سے ہم کنار کررہے ہیں۔ اگر یہ بات وابستگانِ ادارہ جاتِ سرکاری و نیم سرکاری کے ذہنوں کو ذرا بھی متوجہ کرسکے تو انھیں اُردو کے سچے خادموں اور وفاداروں کو بھی اپنی صف میں جگہ دینی چاہیے۔ یہ مطالبہ اس لیے نہیں کہ مدرسہ والے اللہ کے نام پر سرکاری مراعات کے خواہش مند ہیں بلکہ اس لیے اور صرف اس لیے کہ اُردو کے بنیادی مسائل اور حقائق پر مبنی زمینی سوالات سے یہی طبقہ اور یہی حضرات پورے پورے واقف ہیں، یہ جو بھی مشورہ دیں گے اُردو کے فروغ کے حق میں دیں گے۔ بے لوث اور مخلص ہوکر دیں گے۔

اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے عرض کرنا چاہوں گا کہ اُردو کا جمہور مدرسوں سے وابستہ ہے۔ اہلِ مدارس اُردو رسم الخط سے متعلق جو مشورہ اور تبدیلی قبول کرلیتے ہیں، وہی عملی جامہ بھی پہنتا ہے اور جسے یہ قبول نہیں کرتے، وہ صرف اور صرف تجویز اور مشورے تک محدود رہ جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تقویٰ، دعویٰ، شوریٰ، طوبیٰ، عیسیٰ، فتویٰ، روپیہ، مصطفیٰ، عاشورہ اور ناشتہ وغیرہ کا وہی املا رائج ہوگیا ہوتا جس کی سفارش انجمن ترقی اُردو، ترقی اُردو بورڈ اور اُردو کے کئی سرکردہ ماہرینِ املا جیسے رشید حسن خاں، سید بدرالحسن اور نارنگ وغیرہ برسوں پہلے کرچکے ہیں۔ اور آج بھی ان کی سفارشات کے دفتر کے دفتر موجود ہیں مگر جمہوریت کے اس دور میں جمہور تو مدرسے والوں کے ساتھ ہے، تبدیلی تو یہاں سے آئے گی۔ دیکھیے تو اُردو سے وابستہ صاحبانِ اقتدار کو اس سچائی کو سمجھنے میں کتنا وقت لگتا ہے اور کب اُردو کے بنیاد گزار، مخلص اور بے لوث خادموں کے ساتھ انصاف کیا جاتا ہے۔

تعمیر ملت میں مدارسِ اسلامیہ کا حصہ

مولانا اقبال احمد ندوی
دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

مذہبِ اسلام اور دینی علوم سے واقف ہر ذی علم و باشعور فرد اس بات سے اچھی طرح باخبر ہے کہ دنیا کے ہر خطے میں عموماً اور برصغیر ہند و پاک میں خصوصاً مدارسِ دینیہ اسلامیہ دینِ حنیف کے قلعے اور سرحدِ اسلام کے محافظ ہیں۔ یہ مدارس ملتِ اسلامیہ کے لیے سرمایۂ عز وافتخار اور ان کی وہ متاعِ عزیز و بے بہا ہیں جس پر اس کے ملی تشخص کا انحصار اور دین وملت کے بقاوحفاظت کا دارومدار ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ دینی ادارے اسلامی تہذیب وثقافت کا نشان اور اسلامی اقدار وکردار کا منبع وسرچشمہ بھی ہیں۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے مدارس کی اہمیت، افادیت اور ان کے مقام ومرتبے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ ”مدرسہ سب سے بڑی کارگاہ ہے، جہاں آدم گری اور مردم سازی کا کام ہوتا ہے، جہاں دین کے داعی اور اسلام کے سپاہی تیار ہوتے ہیں۔ مدرسہ عالمِ اسلام کا بجلی گھر (پاور ہاؤس) ہے، جہاں سے اسلامی آبادی بلکہ انسانی آبادی میں بجلی تقسیم ہوتی ہے۔ مدرسہ وہ کارخانہ ہے، جہاں قلب ونگاہ اور ذہن ودماغ ڈھلتے ہیں..... مدرسے کا تعلق کسی تقویم، کسی تمدن، کسی عہد، کسی کلچر، زبان وادب سے نہیں کہ اس کی قدامت کا شبہ اور اس کے زوال کا خطرہ ہو، اس کا تعلق براہِ راست نبوتِ محمدی سے ہے، جو عالمگیر بھی ہے اور زندہ جاوید بھی۔ اس کا تعلق اس انسانیت سے ہے جو ہر دم جواں ہے، اس زندگی سے ہے جو ہمہ وقت رواں اور دواں ہے۔“ (پاجا سراغ زندگی ص ۹۰)

مدرسے کا آغاز صفۂ نبوی سے ہوتا ہے اور ہر دور میں اس کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ ہمارے علمائے دین اور قائدینِ ملت نے ہر دور میں اور ہر حال میں اپنی ذمہ داریوں اور فرائضِ منصبی کو بحسن وخوبی پورا کیا ہے۔ انھوں نے دینی اداروں کے قیام، ان کی آبیاری ونگہداشت، ان کی دیکھ ریکھ اور ان کے حفظ وبقا میں بیشمار مشقتیں اٹھائی اور بے پناہ قربانیاں پیش کی ہیں۔ خاص طور سے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد جب انگریزوں کا تسلط پورے برصغیر پر قائم ہوگیا اور ہمارے زعما وقائدین نے عسکری میدان میں انگریزوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت اپنے اندر نہ دیکھی تو انھوں نے اس ملک میں دینِ اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت اور بقا کی یہ تدبیر سوچی کہ پورے ملک میں جگہ جگہ چھوٹے بڑے مدارس قائم کیے جائیں اور ان کے ذریعے سے اپنے مذہبی سرمایے کی حفاظت کی جائے۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور اور دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ جیسے بڑے مدارس اور پھر ان کے تحت ہزاروں کی تعداد میں بیشمار

چھوٹے بڑے مدارس و مکاتب کا پورے ملک میں ایک جال سا پھیلا دیا۔ اس طرح یہ مدارس ناخواندہ و پسماندہ قوم کو جہالت و بے دینی کی تاریکی سے نکال کر علم کی روشنی کی طرف لاتے ہیں اور مردہ قوم کی رگوں میں زندگی کا نیا خون دوڑاتے ہیں۔

یہ مدارس اگر ایک طرف خدمتِ دین اور اشاعتِ علم کا کام کرتے ہیں تو دوسری طرف لوگوں کو امن و آشتی، اتحاد و یکجہتی، شرافت و انسانیت اور اخوت و یگانگت کا پیغام بھی دیتے ہیں اور تعمیرِ ملت اور صیانتِ امت کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مدارس کی اہمیت و افادیت واضح کرتے ہوئے ایک موقعے پر فرمایا تھا:

''اس میں ذرہ برابر شبہہ نہیں کہ اس وقت مدارسِ علومِ دینیہ کا وجود مسلمانوں کے لیے ایسی بڑی نعمت ہے کہ اس سے بڑھ کر متصور نہیں۔ دنیا میں اگر اس وقت اسلام کے بقا کی کوئی صورت ہے تو یہ مدارس ہیں''۔

اسی طرح علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے اپنے ایک نیازمند کو ایک خط میں لکھا تھا کہ ''ان مکتبوں اور مدرسوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انھی مدارس میں پڑھنے دو، اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا، میں انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر ہندستانی مسلمان ان مدارس کے اثر سے محروم ہو گیے تو بالکل اُسی طرح ہوگا، جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈرات اور الحمراء اور باب الاخوتین کے نشانات کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا۔ ہندستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی کے لال قلعے کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا''۔

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ''عربی مدرسوں کی جتنی ضرورت آج ہے، کل جب ہندستان کی دوسری شکل ہوگی، اس سے بڑھ کر ہوگی۔ وہ ہندستان میں اسلام کی بنیاد اور اس کے مرکز ہوں گے۔ لوگ آج کی طرح کل بھی ہوشیار ہوں گے، اس لیے یہ مدرسے جہاں بھی ہوں، جیسے بھی ہوں، ان کو سنبھالنا اور چلانا مسلمانوں کا سب سے بڑا فرض ہے۔ ان عربی مدرسوں کا اگر دوسرا کوئی فائدہ نہیں تو یہی کیا کم ہے کہ یہ غریب طبقوں میں مفت تعلیم کا ذریعہ ہیں۔ اور ان سے فائدہ اٹھا کر ہمارا غریب طبقہ کچھ اونچا ہوتا ہے اور اس کی اگلی نسل کچھ اور اونچی ہوتی ہے اور یہی سلسلہ جاری رہتا ہے''۔

موجودہ دور ترقی کا دور ہے، لیکن بدقسمتی سے ترقی کا معیار یورپ کی نقالی کو قرار دیدیا گیا ہے۔ رہن سہن، بول چال، وضع قطع، کھانے پینے ہر چیز میں ان کی نقالی کی جارہی ہے۔ حد یہ ہے کہ تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ زبان و بیان میں بھی ان کی نقالی ایک فیشن بن چکی ہے۔ آج کل بغیر انگریزی الفاظ کے گٹ پٹ کیے کوئی شخص مثقف اور تہذیب یافتہ نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اب اردو بولنا لکھنا اور اردو میں کوئی کام کرنا دقیانوسیت اور قدامت پرستی شمار کی جاتی ہے۔ پھر ہمارے برادرانِ وطن اور حکومتِ ہند بھی اردو کے ساتھ سوتیلا سلوک کرتے ہوئے اسے ملک بدر کردینے پر آمادہ ہیں۔ ایسے میں ہماری مسلمان نوجوان نسل اردو سے بالکل ہی نابلد ہے۔ ان سے انگریزی میں بات کیجیے، سمجھ لیں گے۔ ہندی بولیے، کوئی مشکل نہیں، لیکن جہاں

آپ نے اردو استعمال کی، خاص طور سے لکھنے میں، وہ فوراً آپ کا منہ دیکھیں گے، گویا کہیں گے کہ ہمارے پلے نہیں پڑا۔ بلکہ اب تو کھل کر کہتے ہیں کہ ہم اردو نہیں سمجھتے، پڑھ نہیں پاتے، لکھ نہیں پاتے، ہندی یا انگریزی میں لکھیے اور ہندی میں سمجھائیے۔ ایسے میں ہمارے یہ دینی و اسلامی مدارس ہی ہیں جو اردو کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ یہاں پڑھنے والے طلبہ اور پڑھانے والے اساتذہ اردو کی وہ خدمت کر رہے ہیں جو کوئی جماعت نہیں کر رہی ہے۔ یہ انھیں کا دم خم ہے جو اردو کو اپنے نفسہائے گرم سے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ماضی میں بھی ہمارے علما و فضلائے مدارس نے اردو کی جو خدمت انجام دی ہے، وہ اظہر من الشمس ہے۔ مولانا شبلی نعمانی، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد اور سرسید احمد خاں، جنھیں اردو کے عناصرِ اربعہ کہا جاتا ہے، جنھوں نے گیسوئے اردو کو سنوارا ہے اور اس زبان کو عروج و ترقی عطا کی ہے، اسی طرح مولانا ظفر علی خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالاعلی مودودی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور دیگر علمائے کرام سب دینی مدارس کے ہی پروردہ اور ساختہ پرداختہ تھے۔

مدارسِ دینیہ اسلامیہ نے علومِ عالیہ کی تحصیل، عقائد کی درستی، توحید و رسالت کی پختگی، اصلاحِ معاشرہ، بدعات و خرافات کا قلع قمع اور انسانی خدمات کی انجام دہی کے شانہ بشانہ عربی، فارسی، اردو اور دیگر زبانوں سے بھی اپنا رشتہ استوار رکھا اور زبان و ادب کی خدمت کو بھی اپنا شعار بنایا ہے۔ ان حضرات نے زبان و ادب سے اپنا رشتہ ہمیشہ قائم رکھا اور جس دور میں جس زبان کا رواج رہا، اس میں طاقت ور اسلوب میں اپنا مافی الضمیر ادا کرتے رہے۔ اس ملک میں عربی، فارسی کے بعد جب اردو کا رواج ہوا، علما حضرات ادھر متوجہ ہوئے اور اس زبان میں بھی اپنی عظمتوں کا پرچم بلند کیا۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ عربی و فارسی میں علمائے کرام و بزرگانِ عظام کی خدمات اور تصنیفات کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''یہ اس وقت کی باتیں ہیں، جب عربی اور فارسی اس ملک میں مسلمانوں کی تصنیفی اور علمی زبان تھی۔ اردو کے رواج کے بعد خود شاہ صاحب (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ) کے فرزندوں نے اردو میں تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا۔ شاہ عبد القادر صاحب کا ترجمہ دہلی کی ٹکسالی زبان کا بہترین نمونہ ہے اور اپنی ادبی خوبیوں اور استناد کی بنا پر اردو کے کلاسیکل ادب میں خاص درجہ رکھتا ہے۔ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی اردو تصنیفات میں ایسی سلاست، سادگی اور برجستگی پائی جاتی ہے کہ دقیق علمی مضامین بھی ذوق پر بار نہیں ہونے پاتے۔ اس ملک میں عرصۂ دراز تک زبان و ادب کی قیادت طبقۂ علماء کے ہاتھ میں رہی اور وہی اس ملک کی ادبی رہنمائی کرتے رہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی نذیر احمد دہلوی اور مولانا شبلی نعمانی ادبِ اردو کے معماروں میں شمار کیے جانے چاہئیں۔ علما نے اپنی لطافتِ ذوق، سلامتِ طبع، سخن فہمی اور انشا پردازی کے ایسے نمونے چھوڑے ہیں جو اردو کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی رحمۃ اللہ علیہ کے مضامین اور مولانا سید عبدالحی ناظمِ ندوۃ العلما کا ''تذکرہ گلِ رعنا'' اور ''تاریخ یادِ ایام'' اردو نثر کا ایسا نمونہ ہے جس میں تاریخی ثقاہت و متانت اور ادبی بانکپن اور رنگینی پہلو بہ پہلو ہیں، اور یادش بخیر مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے

تو اردو کو اپنی علمی تحقیقات اور ادبی مضامین سے گراں بار کر دیا، ان کی کتابیں اب بھی اور بہت دنوں تک نقدِ کامل عیار اور ادب وانشا کا معیار سمجھی جائیں گی۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں نے اردو کو ایک نئی طاقت اور نیا اسلوب بخشا۔ ''الہلال'' کے سحر حلال نے ایک وقت میں سارے ہندستان کو مسحور کر لیا تھا، اب بھی ان کا ایک ایسا ادبی مقام ہے، جو انھیں کے ساتھ مخصوص ہے''۔ (پاجا سراغ زندگی ص ۱۱۵-۱۱۶)

اردو زبان مسلمانوں کی ثقافت کا عظیم سرمایہ ہے، اس ثقافت میں اپنے اگلوں کے حالات، رجحانات، خصوصیات اور اقدار سب کچھ ہے، اور ان سے نئی نسل کا رابطہ ہرگز نہیں ٹوٹنا چاہیے۔ تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان کے مسلمان خاص طور پر دہلی کے مسلمان جس سراسیمگی، مایوسی اور افراتفری کا شکار ہوئے تھے، ان کو جامع مسجد دہلی میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جس زبان و اسلوب میں مخاطب کیا تھا، وہ اردو ہی تھی۔ ان کا خطاب دلوں میں قوت و ہمت پیدا کرنے والا اور عرصے تک ادبی یادگار رہنے کی حیثیت کا مالک ہے۔ اسی طرح آزادی سے قبل انگریزوں کے دورِ اقتدار میں مسجد کانپور اور دیگر سانحوں کے موقعے پر علامہ شبلی نعمانی کی جوشیلی نظمیں، اور مولانا ابوالکلام آزاد کے البلاغ اور الہلال کے اداریے ایسے ادبی شکوہ اور پرزور بیان کے حامل ہوتے تھے، جن سے ہزاروں مسلمانوں کے دلوں میں ہلچل پیدا ہوئی اور اس نے اردو زبان وادب کی بھی خدمت کی۔

دار العلوم دیوبند، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور اور دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ، دار المصنفین اعظم گڑھ وغیرہ جیسے مدارس اور اداروں نے اردو زبان وادب کی جو بیش بہا خدمت انجام دی اور آج بھی انجام دے رہے ہیں، اس کا انکار بھلا کون کر سکتا ہے۔ یہاں سے نکلنے والے رسالے، میگزین اور کتابیں اگر ایک طرف اپنے قارئین کو دینی غذا فراہم کرتے ہیں تو دوسری طرف اردو زبان وادب کی خدمت بھی انجام دے رہے ہیں اور اس کے عروج وترقی میں مناسب کردار ادا کر رہے ہیں۔

جہاں تک اسلامی اور دینی مدارس کا تعلق ہے تو وہاں عموماً ذریعۂ تعلیم اردو ہونے کی وجہ سے اور عربی زبان کے تعلیم و تعلم کے اثر سے اردو کو برابر غذا مل رہی ہے اور تقویت بھی حاصل ہو رہی ہے۔ یہ مدارس ہزاروں کی تعداد میں پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہر شہر اور قصبے میں ان سے وابستہ حضرات ملتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اردو اس ملک میں مختلف علاقوں کے مسلمانوں کے درمیان رابطے کی زبان بنی ہوئی ہے اور ملت کے عمومی مفاد کی بات کو بڑی حد تک ملت کے زیادہ طبقات میں پہنچانے کا ذریعہ بنتی ہے۔

ان مدارس کا اردو زبان وادب کے حفظ و بقا میں جو کردار ہے، وہ صرف زبان کی حد تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ اردو زبان چونکہ عام مسلمانوں کی دینی وعلمی زبان بھی ہے، ان کی مذہبی اصطلاحات، مذہبی کتابیں، دینی علوم زیادہ تر اسی زبان میں ہیں، اس طرح یہ مدارس اردو کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے عقیدے کی حفاظت کا فریضہ بھی انجام دے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے ساتھ اس ملک میں جو معاملہ کیا جا رہا ہے، وہ دراصل یہاں کے مسلمانوں کو ان کی صدیوں کی ثقافت، اسلامی فکر اور گنگا جمنی تہذیب سے محروم کر دینا ہے اور پورے برصغیر کے مسلمانوں کو اس سے جو وابستگی ہے، اور ان کا جو اصل مزاج و

خصوصیات ہے، اس سے ہٹا کر دوسرے مزاج و خصوصیات کی طرف لے جانا ہے۔ اس طرح اس زبان کا خاتمہ یا تبدیلی پورے برصغیر کے مسلمانوں کے تشخص پر زبردست وار ہے، جس سے یہ مسلمان کس حد تک اپنے کو نقصان سے بچا سکیں گے، یہ کہنا مشکل ہے۔

ہندی مسلمانوں کو اگر اردو زبان سے وابستگی اور حصولِ فیض سے محروم کر دیا گیا اور اردو کا ثقافتی، تہذیبی اور مذہبی رشتہ ان کے ہاتھ سے جاتا رہا اور اس کے نتیجے میں بطورِ مثال عبادت کو پوجا، سلام کو پرنام اور خدا کو ایشور کہنے کی منزل آ گئی تو اسلامی عبادت کا تصور ہندو عبادت کے تصور میں اور مسلمان سلام کا تصور ہندو سلام کے تصور میں اور مسلمان کے خدا کا تصور ہندو کے خدا کے تصور میں تبدیل ہو جانا فطری بات ہوگی۔ اس طرح بظاہر تبدیلی صرف زبان کی ہوگی لیکن یہ تبدیلی عملاً لفظِ عبادت کے دائرے میں مذہبی لحاظ سے اور لفظِ سلام کے دائرے میں تہذیبی لحاظ سے اور لفظِ اللہ کے دائرے میں مذہبی عقیدے کے اعتبار سے بھی ظاہر ہو سکتی ہے۔

اور یہ محض خیال آرائی نہیں ہے، بلکہ یہاں کے مسلمان اس حقیقت کا مشاہدہ بچشمِ خود بھی کر چکے ہیں اور کسی حد تک آج بھی کر رہے ہیں کہ برصغیر میں جب انگریزوں کے اثر و غلبے سے انگریزی کا ایسا رواج ہوا کہ کچھ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے یہاں ان کی اصل زبان کی جگہ انگریزی نے لے لی، تو ان طبقوں کے ثقافتی و مذہبی تصورات و احساسات انگریز قوم کے تصورت و احساسات سے زیادہ ہم آہنگ ہو گئے جس کی وجہ سے ایسے تعلیم یافتہ جو صرف انگریزی زبان و ادب کے پروردہ تھے، اپنے کو اپنی اصل قوم میں فٹ محسوس نہیں کر پاتے تھے، اور نہ ان کی قوم ان کو اپنے میں فٹ محسوس کرتی تھی۔ ایسے لوگ ثقافتی اور مذہبی لحاظ سے ایک درمیانی منزل میں پڑ گئے تھے۔ انگریزوں کے غیر قوم ہونے کی وجہ سے وہ انگریز نہیں ہو سکتے تھے، اور اپنی قوم کی ثقافت سے جدا ہو جانے کی وجہ سے وہ اپنی قوم کے مزاج کے نہیں رہ سکے۔ اس میں بنیادی اثر زبان کی تبدیلی کا ہوا۔

اب انگریز تو چلے گئے اور انگریزی کی وہ اہمیت اور مقام بھی باقی نہیں رہا، جس سے اردو اور اس کی تہذیب میں وہ تبدیلی پیدا کر سکے، لیکن ہندستان میں اردو کو متاثر کرنے والے اسباب اب بھی موجود ہیں، ان کا اثر پڑ سکتا ہے جو یہاں کے مسلمانوں کے لیے تہذیبی تبدیلی کا مرادف بن سکتا ہے اور یہ تہذیبی تبدیلی صرف تہذیبی تبدیلی نہ ہوگی بلکہ اس سے مذہب کی جس قدر وابستگی ہے، اسی قدر وہ تبدیلی مذہبی تصورات و احساسات پر بھی اثر انداز ہوگی۔

(غبارِ کارواں ص ۱۲۵-۱۲۶)

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مدارس موجودہ دورِ یاجوجی میں سدِ سکندری کی حیثیت رکھتے ہیں اور تہذیب و ثقافت، عقائد اور زبان و بیان کی حفاظت میں ان کی خدمات ناقابل انکار ہیں۔ ان کا بقا مسلمانوں کا بقا ہے، ان کی تہذیب کا بقا ہے، ان کی زبان و بیان کا بقا ہے۔ اور ان چیزوں کا بقا ہمیں اپنی جانوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اس لیے ہمیں ان مدارس کی قدر کرنی چاہئے اور دامے درمے قدمے سخنے ان کا تعاون بھی کرنا چاہئے۔ یہ طوفانِ بلاخیز میں سفینۂ نوح ہیں جن پر ہم سب کی نجات منحصر ہے۔ ☆☆☆☆

ادبِ نبوی کا انسانی پہلو

مولانا انعام اللہ قاسمی
المعہد الاسلامی، مانک مئو، سہارنپور

انسانیت کی تعمیر و ترقی میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک تعلیمات ادب و بلاغت کا شاہکار اور عطرِ مجموعہ ہے۔ جس دربار سے اور جن کے مبارک کلام سے دنیا بھر کے ادبا نے روشنی حاصل کی اور اسی کی روشنی میں کچھ انسانیت کی خدمت کا فریضہ انجام دیا۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام جہانوں کے لیے رحمت بن کر تشریف لائے۔ آپ کی تعلیمات میں حیوانات، پرندے، یہاں تک کہ موذی جانوروں کی خیر خواہی اور بھلائی مضمر ہے۔ پھر کیسے ممکن تھا کہ انسان جو مسجودِ ملائک ہے، اس کائنات کا گلِ سرسبد ہے، ﴿ لقد کرمنا بني آدم ﴾ اور ﴿ لقد خلقنا الإنسان في أحسن تقويم ﴾ کہہ کر جس کی عزت افزائی کی گئی ہے، اس کی فلاح وصلاح، کامیابی و کامرانی اور عروج وارتقا کا سامان دامنِ نبوت میں موجود نہ ہو۔

کاشت کاروں کو انسانوں کی ہم دردی اور خیر خواہی کے لیے ان الفاظ میں آمادہ کیا: ﴿ ما من مسلم يغرس غرسًا أو يزرع زرعًا فيأكل منه طير أو إنسان إلا كان له صدقة ﴾ مسلمان کی کھیتی سے انسان خواہ وہ عیسائی ہو، یہودی ہو، فاسق و فاجر ہو، مشرک ہو، اگر وہ کھاتا ہے تو یہ کاشت کار کے لیے صدقہ ہے۔

تاجروں کے بارے میں ہدایت فرمائی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں: ﴿ من غشّ فليس منا ﴾ کہ جو دھوکہ دے، وہ ہم میں سے نہیں۔ یہاں صرف مومن، مسلمان یا کسی خطے کے آدمی کے ساتھ دھوکہ کرنے کو منع نہیں فرمایا بلکہ پوری نوعِ انسانی اس میں شامل ہے۔

ورع و زہد کے بارے میں جناب حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہوا جس کے راوی حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ ہیں: ﴿ ازهد فيما في أيدي الناس يحبك الناس ﴾ کہ لوگوں کے ہاتھ میں جو بھی چیزیں ہیں، مال و دولت، عہدہ و منصب، ان سب سے بے نیاز ہو جاؤ، کنارہ کشی اختیار کر لو تو عند الناس تم محبوب ہو جاؤ گے۔

خیر و بھلائی کے باب میں ارشاد ہوا جس کے راوی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ہیں: ﴿ إرشاد الرجل في أرض الضلال لك صدقة، و بصرك للرجل الردي لك صدقة، و إماطتك الحجر و

الشوک و العظم عن الطریق لک صدقة ﴾ بھٹکے ہوئے آدمی کو سیدھی راہ بتانا تمھارے لیے صدقہ ہے۔ کمزور نظر والے کو راستے پر لگانا یہ بھی تمھارے لیے صدقہ ہے۔ راستے سے پتھر، کانٹے اور ہڈی کو ہٹا دینا، یہ بھی تمھارے لیے صدقہ ہے۔" رجل " میں تمام نوع انسانی شامل ہے۔

حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ اور قیس بن سعد رضی اللہ عنہ قادسیہ میں تھے۔ ایک جنازہ ان کے قریب سے لے جایا گیا۔ یہ دونوں کھڑے ہو گیے۔ ان سے کہا گیا: ﴿ إنها من أهل الأرض أي من أهل الذمة ﴾ کہ یہ تو ذمی ہے۔ ان دونوں بزرگ صحابی رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اسی طرح ایک جنازہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب سے لے جایا گیا، فقام ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گیے ﴿ فقيل إنها جنازة يهودية ﴾ کہا گیا: یہ تو یہودی کا جنازہ ہے۔ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿ أليست نفسًا ﴾ کہ کیا یہودی انسان نہیں ہے؟۔

اخلاقیات کے باب میں ایک بڑی عجیب وغریب حدیث ہے۔ راوی حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ فرماتے ہیں: ﴿ قال رسول الله صلى الله عليه و سلم : لا يحل لرجل أن يفرق بين اثنين إلا بإذنهما ﴾ کہ کسی آدمی کے لیے یہ بات زیبا نہیں کہ وہ دو آدمیوں کے درمیان ان کی اجازت کے بغیر حائل ہو، چاہے وہ کسی بھی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں۔ ایک دوسری حدیث میں یہ مضمون اور واضح ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب تین لوگ ہوں تو تیسرے کو چھوڑ کر دوسر گوشی نہ کریں۔ ﴿ من أجل أن ذلک يحزنه ﴾ کیوں کہ یہ بات تیسرے آدمی کو غم زدہ کرے گی۔ یہاں پر بھی کسی مومن اور مسلم کی قید نہیں۔ وہ تین آدمی کسی بھی جماعت و طبقے سے ہو سکتے ہیں۔ پڑوسی کے سلسلے میں ارشاد ہوا کہ جب تم شوربا بناؤ تو اس میں پانی زیادہ کر لو اور اپنے پڑوسی کا خیال رکھو ﴿ وتعاهد جيرانک ﴾۔ جیران میں ہر قسم کا پڑوسی شامل ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: ﴿ قالت : يا رسول الله ! إن لي جارين ، فإلى أيهما أهدي ﴾ کہ میرے دو پڑوسی ہیں تو میں ان میں سے کس کے پاس ہدیہ بھیجوں؟ فرمایا: اپنے دونوں پڑوسیوں میں سے اس کو ہدیہ بھیجو جو تمھارے دروازے کے زیادہ قریب ہو۔ ﴿ إلى أقربهما منک بابًا ﴾۔

شفعہ وغیرہ کے سلسلے میں فرمایا: ﴿ لا يحل له أن يبيع حتى يؤذن شريكه ﴾ ۔ ایک جگہ ارشاد ہوا: ﴿ الجار أحق بسقبه ﴾ کہ مکان بغیر پڑوسی کی اجازت کے فروخت نہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں پڑوسی مکان کا زیادہ حق دار ہے۔ ایک روایت میں ہے: ﴿ خير الجيران عند الله خيرهم لجاره ﴾ کہ اللہ کے نزدیک بہترین پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے حق میں بہتر ہو۔ شریک اور جار میں عموم ہے۔ کمزوروں اور ضعیفوں کے سلسلے میں زبانِ رسالت سے ارشاد ہوا۔ حضرت مصعب بن سعد رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میرے والد سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ﴿ هل تنصرون و ترزقون إلا بضعفائكم ﴾ کہ یہ جو تمھاری مدد کی جاتی ہے

اور تمھیں روزی دی جاتی ہے تو تمھیں یہ مدد اور روزی تمھارے کمزور لوگوں کے طفیل میں ملتی ہے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ راوی ہیں، کہتے ہیں: ﴿ سمعت رسول الله صلى الله عليه و سلم يقول : ابغوني في الضعفاء فإنما تنصرون و ترزقون بضعفائكم ﴾ یعنی مجھے کمزوروں میں تلاش کرو کیوں کہ تمھاری مدد و نصرت اور روزی کا ذریعہ یہی کمزور ہیں۔ دونوں حدیثوں میں ضعفا عام ہیں۔ اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دیگر قوم کے ضعفا کا بھی بڑا خیال فرماتے تھے۔ غزوات وغیرہ میں لشکر کے سپہ سالاروں کو اس سلسلے میں خاص ہدایات دی جاتی تھیں۔

ابوداؤد شریف کی ایک روایت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿ ألا من ظلم معاهدًا أو انتكسه أو كلفه فوق طاقة أو أخذ منه شيئًا بغير طيب نفس ﴾ ، دیکھو سنو، کسی غلام ذمی، اپنے ماتحت پر جو کوئی ظلم کرے یا اس کے حق میں کوتاہی کرے یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالے، یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف چھینے، ایسے کافر غیر مسلم کے بارے میں فرمایا کہ میں قیامت کے دن اس کا وکیل بن کر کھڑا ہوں گا اور تم سے اس کا حق دلواؤں گا: ﴿ فأنا حجيجه في يوم القيامة ﴾۔

اکرامِ ضیف کے سلسلے میں ارشاد ہوا: ﴿ من كان يؤمن بالله و اليوم الآخر فليكرم ضيفه ﴾ کہ جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔ یہاں ہر قسم کا ضیف مراد ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں غیر مسلم مہمانوں کے ساتھ اکرام کے بیشتر نمونے موجود ہیں۔ ایک مشہور حدیث ہے۔ محدثینِ کرام حدیث کی اجازت کے سلسلے میں سب سے پہلے اسی کو پڑھاتے ہیں: ﴿ الراحمون يرحمهم الرحمن ، ارحموا من في الأرض يرحمكم من في السماء ﴾ کہ لوگوں پر رحم کرنے والوں پر رحمٰن یعنی اللہ تعالیٰ رحم فرماتے ہیں۔ تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔ ﴿ من في الأرض ﴾ میں سبھی حضرات شامل ہیں۔

حدیثِ قدسی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ روزِ محشر فرمائیں گے: میں بھوکا تھا، تم نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ میں بیمار تھا، تم نے میری مزاج پرسی نہیں کی۔ بندہ عرض کرے گا: یا اللہ! آپ تو کھلانے والے، صحت دینے والے اور عطا کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرا فلاں بندہ بیمار تھا، فلاں محتاج تھا، فلاں بھوکا تھا، اگر اس کی مزاج پرسی کرتے، اسے کھلاتے تو وہ مجھے ہی کھلاتے۔ یہاں قطعاً مسلمان کی قید نہیں۔ ذرا غور تو کریں جو رسول یہ فرماتا ہو کہ میں نے ایک عورت کو بلی کے ساتھ زیادتی کرنے پر جب کہ وہ دین دار بھی تھی، جہنم میں دیکھا۔ اور ایک عورت کو جو فاحشہ تھی، کتے کو پانی پلانے پر جنت میں دیکھا، یہ تو انسان بھی نہیں، ان کے ساتھ خیر خواہی پر اتنا اجر و ثواب! انسان کے ساتھ ہم دردی، خیر خواہی، اس کی تعمیر و ترقی تو شریعت میں مطلوب و محمود ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے: ﴿ المؤمن من أمن الناس على دمائهم و أموالهم ﴾ کہ مومن وہ ہے کہ لوگ

اپنے خون اور اموال کے سلسلے میں اس سے مامون ہوں۔ ایک حدیث میں فرمایا:﴿ من لا یرحم الناس لا یرحمه الله ﴾ جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اللہ بھی اس پر رحم نہیں فرماتے۔ حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:﴿ قال رسول الله صلی الله علیه و سلم : أنا زعیم ببیت في ربض الجنة لمن ترک المراء و إن کان محقًا ﴾ کہ میں اس آدمی کے لیے جنت کے ربض میں ایک گھر کا ضامن ہوں جس نے جھگڑے کو چھوڑ دیا اگرچہ وہ حق پر ہو۔ جھگڑا کسی کے بھی ساتھ، اس میں کوئی مسلمان کی قید نہیں ہے۔ ایک حدیث میں ہے:﴿ من دلّ علی خیر فله مثل أجر فاعله ﴾ کہ جو کسی بھلائی پر رہنمائی کرے تو کرنے والے کے برابر رہنمائی کرنے والے کو بھی ثواب ملتا ہے۔ اس رہنمائی میں بھی تمام طبقات شامل ہیں۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب کوئی ضرورت مند آقا کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتا :﴿ إذا أتاه طالب حاجة ﴾ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اہلِ مجلس کی طرف متوجہ ہوتے اور فرماتے:﴿ اشفعوا فلتؤجروا ﴾ یہاں بھی طالب میں تمام طبقاتِ انسانی شامل ہیں۔ ایک حدیث میں فرمایا:﴿ یمسک عن الشر فإنها صدقة ﴾ اور ایک جگہ فرمایا:﴿ تکف شرک عن الناس ﴾ کہ انسانوں کو اپنے شر سے بچاؤ۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے اپنے غلام سے کہہ دیا:﴿ یا ابن السوداء ! ﴾ او حبشن کے بیٹے!۔﴿ فقال النبي صلی الله علیه و سلم : أعیرته بأمه ؟ ﴾ ، کیا تو نے اس کی ماں کے بارے میں اس کو عار دلائی؟۔﴿ إنک امرؤ فیک جاهلیة ﴾ تم ابھی جاہلیت سے نکلے نہیں ہو۔ یہ خادم تمھارے بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمھارا ماتحت بنایا ہے۔ جس بندے کا بھائی اس کا ماتحت ہو، اس کو چاہیے کہ اس کو وہی کھلائے جو کچھ وہ خود کھائے، اس سے پُر مشقت کام نہ لے اور اگر کچھ پُر مشقت کام لینا ہی ہو تو اس کی مدد کرے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:﴿ لن تؤمنوا حتی تراحموا ، قالوا: یا رسول الله (ﷺ) : کلنا رحیم ﴾ کہ تم ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم آپس میں رحم کرنے والے نہ ہو۔ ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ (ﷺ): ہم تو سب کے سب رحم کرنے والے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنے ساتھی سے رحم کے ساتھ پیش آنا مراد نہیں﴿ لیس برحمة أحدکم صاحبه ﴾ اس سے مراد عمومی رحمت ہے۔﴿ و لکن رحمة عامة ﴾۔

مکہ مکرمہ میں ایک مرتبہ قحط آیا: اہلِ مکہ بھوکے مرنے لگے۔ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:﴿ یا محمد ! إنک تأمر بطاعة الله و بصلة الرحم ، و إن قومک قد هلکوا ﴾ کہ اے محمد (ﷺ)! آپ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور صلہ رحمی کا حکم فرماتے ہیں اور آپ کی قوم ہلاک ہو چکی ہے۔﴿ فادع الله لهم ﴾ آپ ان کے لیے دعا کیجیے۔

حاتم طائی کی بیٹی سفانہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قید میں آگئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے آزاد فرمایا۔ اس نے کہا: میں ایک سخی باپ کی بیٹی ہوں۔ میرے گاؤں والوں کو بھی جو آپ کی قید میں ہیں، آزاد فرمادیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے نہ صرف یہ کہ گاؤں والوں کو آزاد کیا بلکہ نئے پہننے کے کپڑے، کھجوریں، سواری اور یہاں تک کہ سفر کا خرچہ بھی دیا۔ اپنی بہن سفانہ کی زبانی حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے جب یہ قصہ سنا تو خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ حضرت عدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ﴿ جلست علیها و جلس رسول الله صلی الله علیه و سلم علی الأرض ﴾ کہ میں تو آقا کی مسند پر بیٹھا اور آقا زمین پر بیٹھے۔ غلاموں پر بھی کتنی شفقت فرمائی۔ انھیں فرش سے عرش پر بیٹھایا۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے لیے بددعا نہ کرو۔ ﴿ و لا تدعوا علی أولادکم ﴾ اپنی اولاد کو بھی نہ کوسو۔ ﴿ و لا تدعوا علیٰ خادمکم ﴾ اپنے خادم کو بھی برا بھلا نہ کہو۔

حضرت زاذان کندی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا۔ انھوں نے اپنا ایک غلام آزاد کیا تھا۔ زمین سے ایک معمولی چیز اٹھائی اور فرمایا : میرے لیے اس غلام کو آزاد کرنے میں اتنا بھی اجر نہیں، کیوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو اپنے غلام کو طمانچہ مارے، اس کا کفارہ اس غلام کو آزاد کرنا ہے۔ ﴿ من لطم مملوکًا له أو ضربه فکفارته أن یعتقه ﴾۔ ایک جگہ فرمایا: ﴿ کفی بالمرء إثمًا أن یحبس عمن یملک قوته ﴾ انسان کے گنہ گار ہونے کے لیے کافی ہے کہ وہ اپنے ماتحت کی روزی میں تنگی کرے۔

الحاصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کی مکمل رہنمائی فرمائی اور خیر خواہی فرمائی اور اس کا آغاز ایسے وقت میں کیا جب پوری دنیا میں انسانیت کے ساتھ ظلم، سفاکی نہ صرف یہ کہ جائز بلکہ قابلِ تحسین سمجھی جاتی تھی۔ مادرِ گیتی اپنی پوری نسل کو زندہ دفن کر دینا چاہتی تھی۔ مفکرِ اسلام حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں ''جاہلیت میں تمدن صرف سڑا ہی نہیں تھا، اس میں کیڑے پڑ گیے تھے۔ انسان نوعِ انسانی کا شکاری بن گیا تھا۔ اس کو کسی انسان کی جاں کنی، کسی زخمی کی تڑپ اور کسی مصیبت زدہ کی کراہ میں وہ مزہ آنے لگا تھا جو جام وسبو میں اور دنیا کے لذیذ سے لذیذ کھانے اور خوش نما منظر میں نظر نہیں آتا تھا۔ آپ روما کی تاریخ پڑھیے جس کی فتوحات، نظم ونسق اور قانون سازی اور تہذیب کے دنیا میں ڈنکے بجے، یوروپین مورخ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ اہلِ روما کے لیے سب سے زیادہ دل چسپ، فرحت افزا اور مست کر دینے والا نظارہ وہ ہوتا تھا جب باہم شمشیر زنی یا خوں خوار جانوروں کی لڑائی میں ہزیمت خوردہ اور مجروح شمشیر زن جاں کنی کی تکلیف میں مبتلا ہوتا اور موت کے کرب میں آخری ہچکی لیتا، اس وقت روما کے خوش باش اور زندہ دل تماشائی اس خوش کُن منظر کو دیکھنے کے لیے ایک دوسرے پر گرے پڑتے اور پولس کو بھی انھیں کنٹرول میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔

انسانیت کی خدمت کا قرآنی تصور

مولانا محمد طیب ندوی، اجین

انسان کی تخلیق کا مقصد رب کی عبادت کرنا ہے۔ عبادت کی دو قسمیں ہیں: (۱) بدنی عبادت جیسے نماز (۲) مالی عبادت جیسے زکوۃ۔ مالی عبادت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد خلقِ خدا کی خدمت، نصرت اور اس کا تعاون ہے۔ اسلام کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی خدمت کوئی دنیاداری کا عمل نہیں بلکہ عینِ عبادت ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿ یا أیھا الذین آمنوا ارکعوا و اسجدوا و اعبدوا ربکم و افعلوا الخیر لعلکم تفلحون ﴾ (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، رکوع کرو، سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور خیر پر عمل کرو، اس سے امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے)۔ یہاں عبادت سے پہلے رکوع، سجدہ یا یوں کہیے کہ نماز کا حکم دیا گیا ہے، اور عبادت کے بعد خیر پر عمل کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اس قول کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ خیر پر عمل کرنے کی دو شکلیں ہیں: ایک ہے اللہ تعالیٰ کی تعظیم بجالانا اور دوسری ہے اس کے بندوں کی خدمت کرنا۔ (تفسیرِ کبیر)۔

انسانوں کی خدمت اور بھلائی کے جو کام انجام دیے جاتے ہیں، ان کی عظمت اور برتری کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوسکتا ہے کہ وہ خدا کی عبادت بن جاتے ہیں۔ (خدمتِ خلق کا تصور اسلام کی نظر میں)۔

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی شہرہ آفاق کتاب ''سیرۃ النبی'' کے حصہ پنجم میں روزے کے مقاصد کے باب میں رقم طراز ہیں: ''اُن تمام احکام پر نظر ڈالیے جو فدیہ اور کفارے سے متعلق ہیں تو معلوم ہوگا، ان مواقع میں روزے کا بدل غریبوں کو کھانا کھلانا قرار دیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ اور غریبوں کو کھانا کھلانا یہ دونوں باہم ایک دوسرے کے قائم مقام ہیں۔ ایسے لوگ جو فطرۃً کمزور اور دائم المرض یا بہت بوڑھے ہوتے ہیں اور جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، ان کو روزے کے بجائے حکم ہوتا ہے: ﴿ و علی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین ﴾ (البقرۃ: ۱۸۴) اور جو لوگ مشکل سے روزہ رکھ سکتے ہوں، وہ ایک مسکین کو کھانا فدیہ دیں۔ حج میں اگر کسی عذر یا بیماری کے سبب احرام سے پہلے سر منڈانا پڑے تو: ﴿ ففدیۃ من صیام أو صدقۃ أو نسک ﴾ (البقرۃ: ۱۹۶) کہ تو روزہ یا خیرات یا قربانی فدیہ ہے۔ جو لوگ حج یا عمرہ ایک احرام میں ادا کریں جس کو تمتع کہتے ہیں، ان پر قربانی واجب ہے جو غریبوں ہی میں تقسیم کی جاتی ہے، اگر یہ نہ ہوسکے ﴿ فصیام ثلاثۃ أیام في الحج و سبعۃ إذا رجعتم ﴾ (البقرۃ: ۱۹۶) تو دس روزے رکھے تین حج میں اور سات گھر آکر۔ حج میں جانور کا شکار منع ہے، اگر کوئی جان بوجھ کر ایسا کرے تو اس پر اسی جانور کے مثل کی قربانی لازم آتی ہے جو منی میں جاکر ذبح کیا جائے، اگر یہ نہ ہوسکے تو ﴿ أو کفارۃ طعام مساکین أو عدل ذلک

صیامًا ﴾ (المائدۃ : ۸۹) ترجمہ: یا چند مسکینوں کو کھانا یا اسی کے برابر روزہ۔ اگر کوئی بن ارادہ قسم کھا کر توڑ دے تو اس پر دس مسکینوں کو کھانا کھلانا واجب ہے یا ایک غلام کو آزاد کرنا، اگر یہ نہ ہو سکے تو ﴿ فصیام ثلاثۃ أیام ﴾ (المائدۃ : ۸۹) تو تین دن کے روزے رکھے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو محرمات سے تشبیہ دے کر اس کو اپنے اوپر حرام کر لے اور پھر اس کی طرف رغبت کرے تو اس پر ایک غلام کا آزاد کرنا لازم ہے لیکن اگر یہ اس کی قدرت میں نہ ہو ﴿ فصیام شھرین متتابعین ﴾ (المجادلۃ : ۵۸) ترجمہ: تو دو مہینے متواتر روزے رکھے، اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو ﴿ فاطعام ستین مسکینًا ﴾ (المجادلۃ : ۵۸)۔ ان احکام سے بہ خوبی ظاہر ہے کہ روزہ درحقیقت صدقہ وخیرات غریبوں کے کھلانے بلکہ غلاموں کا آزاد کرنے کا قائم مقام ہے"۔

اس موقعے پر چند احادیثِ نبویہ بھی پیشِ نظر رہیں جو علم وحکمت کے بڑے بڑے خزانے ہیں جن میں اسی مفہوم کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوزے میں دریا بند کرنے کے سے انداز میں بیان فرمایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ﴿ من یحرم الرفقۃ یحرم الخیر کلہ ﴾ جو شخص دل کی نرمی سے محروم رہا وہ کل کے کل خیر سے محروم ہو گیا۔ ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ﴿ من لا یرحم لا یُرحَم ﴾ اللہ اس شخص پر رحم نہیں فرماتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا۔ ایک اور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿ الخلق عیال اللہ ﴾ ساری مخلوق اللہ کے کنبے کی مانند ہے۔ لہٰذا اگر اللہ سے محبت ہے تو اس کے کنبے یعنی مخلوق سے محبت نہیں ہوگی؟۔ ایک حدیثِ قدسی میں الفاظ آتے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ شکوہ فرمائیں گے کہ اے میرے بندے! میں بھوکا تھا، میں نے تجھ سے کھانے کو مانگا، تو نے مجھے کھلایا نہیں۔ اے میرے بندے! میں ننگا تھا، میں نے تجھ سے چاہا کہ مجھے کپڑا پہنا دے، تو نے نہیں دیا۔ بندہ عرض کرے گا کہ اے پروردگار! تو پاک ہے اس سے کہ تجھے بھوک لگے یا عریانی لاحق ہو۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرا وہ فلاں بندہ جو تیرے پاس اس وقت حاضر ہوا تھا، وہ بھوکا تھا اور فلاں بندہ جو تیرے پاس اس وقت آیا تھا کہ اس کے پاس ستر پوشی کے لیے مناسب لباس نہیں تھا۔ ان کا جو ہاتھ تیرے سامنے دستِ سوال بن کر آیا تھا، وہ میرا ہی ہاتھ ہے۔ اندازہ لگائیے کہ یہ اہمیت ہے ہمارے دین میں حاجت مندوں کی حاجت روائی کی۔

حسنِ سلوک کسی خاص گروہ اور جماعت کے ساتھ نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اپنوں کے ساتھ بھی اور غیروں کے ساتھ بھی۔ ہم خیال اور ہم عقیدہ افراد کے ساتھ بھی اور ان لوگوں کے ساتھ جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ بھی اس کے مستحق ہیں جو ہماری زبان بولتے ہیں اور وہ بھی جن کے اظہارِ خیال کا ذریعہ دوسری زبان ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید نے مسکینوں، محتاجوں، معذوروں، یتیموں اور وسائل سے محروم انسانوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا عام حکم دیا ہے۔ کہیں بھی اس نے یہ ہدایت نہیں کی کہ کسی خاص فرقے، جماعت اور رنگ ونسل کی تو خدمت کی جائے اور دوسروں کی نہ کی جائے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿ خیر الناس من ینفع الناس ﴾ کہ لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو لوگوں کے کام آئے۔ انسانیت کی خدمت، ہمدردی وحسنِ سلوک کے لیے یہ حدیث شریف بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

یہی ہے عبادت ، یہ ہے دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انسانوں کے انساں

خدمتِ انسانیت میں

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا معتدل ادبی رویہ

مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نوراللہ مرقدہ عالمِ اسلام کے لیے کسی ابرِ رحمت سے کم نہ تھے۔ آپ کا وجود مسلمانوں کے لیے بڑے خیر و برکت کا باعث تھا۔ آپ ان کے لیے سرچشمۂ ہدایت اور ایک مشفق و مربی کا درجہ رکھتے تھے۔ امتِ مسلمہ کے مسائل و مشکلات سے بخوبی واقف تھے۔ اس لیے ان مسائل میں دلچسپی لے کر ان کا بہترین حل پیش کرتے تھے۔ اطرافِ عالم کے مسلمان آپ سے دعوت و تبلیغ کے میدان میں حکمت و موعظت کا سبق سیکھتے تھے۔ حالات چاہے جیسے بھی ہوں، ہمیشہ اسلامی موقف پر جمے رہنے کی تلقین فرماتے تھے۔

حضرت مولانا ہر ممکن طریقے سے اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے میں سرگرمِ عمل تھے۔ ان کے لیے اگر ایک طرف تالیف و تصنیف کی بے پناہ مشغولیت تھی تو دوسری طرف اسفار و ملاقات کا لامتناہی سلسلہ تھا۔ اعلاءِ کلمۃ اللہ آپ کی زندگی کا حقیقی ہدف اور اصل نصب العین تھا۔ چنانچہ آپ نے امتِ مسلمہ کی عظمتِ رفتہ کی بحالی، اسلامی تہذیب و تمدن کا پرچم پورے عالم میں لہرانے، دشمنانِ اسلام کے اعتراضات کا کافی و شافی جواب دینے، ان کے ناپاک عزائم اور ان کی سازشوں کا پردہ چاک کرنے کے لیے مصر و فلسطین کی خاک چھانی، امریکہ و یورپ کے شہروں اور وہاں کے تعلیم و تہذیب کے مراکز کی سیر کی، اسپین کے شکستہ در و دیوار کی عبرت ناک داستانیں سنا کر مسلمانوں کی حمیتِ دینی اور ان کی غیرت کو للکارا، خلافتِ عثمانیہ کے زوال کے اسباب بیان کر کے ان کے ذہن و دماغ کو جھنجھوڑا، کتبِ تاریخ کے اوراقِ پارینہ کو کھنگالا اور اسلامی تہذیب کے ایک ایک پہلو کو روشن و بے غبار ثابت کر کے دم لیا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے مرشد و مربی حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے خاص توجہ اور اصرار کے ساتھ عالمِ اسلام میں قادیانیت کا تعارف کرانے اور وہاں کے علمی اور دینی حلقوں کو اس نئی نبوت سے متعارف کرانے کے لیے عربی میں ایک مکمل کتاب کی تالیف کا حکم دیا۔ اور حضرت رائے پوریؒ کی خصوصی توجہ سے یہ کتاب عربی زبان میں تین ہفتوں کی مشغولیت کے بعد تیار ہوگئی، جس کا نام " **القادياني و القاديانية** " رکھا گیا اور اس کی عالمِ اسلام کے تمام حلقوں میں پذیرائی ہوئی۔ پھر اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا اور کافی مقبول ہوا۔ اور ردِ قادیانیت میں اس کتاب کا

فائدہ وسیع پیمانے پر ظاہر ہوا۔ یہ کتاب ادب اور حکمت و موعظت کے اسلوب میں لکھے جانے کی وجہ سے قادیانی حلقوں میں بھی اس کا اچھا اثر پڑا اور عقیدۂ ختمِ نبوت کے سمجھنے میں اس کتاب کا کردار نہایت مؤثر اور مقبول ثابت ہوا اور اس حلقے کے لوگوں نے بھی اسے دل چسپی سے پڑھا اور عقیدۂ ختمِ نبوت کو تقویت حاصل ہوئی۔

ردِ قادیانیت کی اس کوشش اور عقیدۂ ختمِ نبوت کو دل کی گہرائیوں میں راسخ کرنے کے اس مثبت اور مؤثر انداز کے بعد ایک نئے فتنے اور لاشعوری ارتداد کی طرف حضرت مولاناؒ کا ذہن متوجہ ہوا، جس نے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے، یعنی یورپ کی مغربی تہذیب اپنی آب و تاب کے ساتھ عالمِ اسلام پر حملہ آور ہے، اور لاشعوری طور پر لوگ اسلامی شریعت اور اس کے نظامِ حیات سے غافل ہو کر اس تہذیب کی چمک دمک کا شکار ہو چکے ہیں۔ یہ فتنہ حضرت مولاناؒ کے ذہن و دماغ پر چھایا رہا۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر مولانا نے "**ردة و لا أبا بكر لها**" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، وہ دمشق سے نکلنے والے عربی زبان کے مشہور مجلّہ "**المسلمون**" میں شائع ہوا۔ مضمون کی دوسری قسط "**دعوة جديدة**" کے عنوان سے اسی پرچے میں شائع ہوئی۔

اس صورتِ حال کا حضرت مولاناؒ پر شدید اثر ہوا، اور اسی کے نتیجے میں "مجلسِ تحقیقات ونشریاتِ اسلام" کا ادارہ قائم کیا گیا۔ مناسب ہوگا کہ اس لاشعوری فتنۂ ارتداد کے سلسلے میں خود حضرت مولاناؒ کی تحریر پیش کر دی جائے تاکہ مفہوم اچھی طرح واضح ہو جائے:

"میں نے اسلام میں ایک نئے قسم کے ارتداد کی نشان دہی کی۔ یہ وہ ارتداد ہے جو شرقِ اسلامی پر یورپ کی سیاسی وتہذیبی تاخت کے پیچھے پیچھے آیا ہے، اور یہ سب سے عظیم ارتداد ہے جو عہدِ رسالت سے لیکر آج تک کی اسلامی تاریخ میں رونما ہوا ہے۔ یہ ارتداد لادینیت ہے، جو مسلمان تعلیم یافتہ طبقے کے بے شمار افراد کو اپنی گرفت میں لے چکا ہے، لیکن پچھلی ارتدادی تحریکوں اور لہروں کے برخلاف اس ارتداد کی زد میں آنے والا اور ضروریاتِ دین اور حقائقِ دینی کا انکار کرنے والا کسی کلیسا یا مندر میں نہیں جاتا اور نہ تبدیلیٔ مذہب کا خود اعلان کرتا ہے، اور نہ اس کا اسلامی معاشرہ اس پر چونکتا ہے اور نہ اس سے فصل وانقطاع کا وہ معاملہ کرتا ہے، جو مرتدینِ سابقین کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ درحقیقت اس خیال کی بنیاد اور اس مسئلے کی طرف توجہ فاضلِ گرامی ڈاکٹر رفیع الدین صاحب مرحوم کے ایک مضمون سے ہوئی تھی۔ میں نے یہ بنیادی تصور لے کر اس کو اس مضمون میں شرح وبسط کے ساتھ لکھا۔ لادینیت کی عالم گیر اشاعت کا راز بھی بتایا، عالمِ اسلام میں اس کے اہم مظاہر کی بھی نقاب کشائی کی، پھر اس کے علاج کے طریقے، نئی طاقت ور دعوتِ ایمان، اور اس کے لیے نئے علمی اداروں کی ضرورت، نئے ذہن کو سامنے رکھ کر طاقت ور لٹریچر کی تیاری پر زور دیا، اور اس سنگین صورتِ حال کی تصویر کشی کی، جس سے عالمِ اسلام دوچار ہے۔

یہ مضمون دو قسطوں میں "**ردة جديدة**" اور "**دعوة جديدة**" کے عنوان سے "**المسلمون**" میں شائع ہوا۔ بعد میں یہی ایک مستقل رسالے کی شکل میں "**ردة و لا أبا بكر لها**" (فتنۂ ارتداد ہے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی

ابوبکر نہیں) کے عنوان سے شائع ہوا، جو مختلف وقتوں میں اور مختلف اداروں کی طرف سے ہزاروں کی تعداد میں طبع ہوا، اور منی وعرفات تک میں اس کی تقسیم ہوئی۔ غالباً راقم کا کوئی مضمون، رسالہ یا کتاب اتنی بڑی تعداد میں نہ شائع ہوئی، نہ اثر انداز۔ اس مضمون کے لکھنے اور شائع کرنے کے بعد شدت سے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس اعتقادی اور تہذیبی ارتداد اور اس فکری واخلاقی انتشار کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک مستقل مجلس (Academy) کی تاسیس ہونی چاہیے، جو اس کام کا بیڑا اٹھائے اور اسی کو اپنا موضوع بنائے۔ چنانچہ مئی ۱۹۵۹ء میں ایک صاحبِ خیر کی ایک ہزار کی رقم سے اس کی تاسیس ''مجلسِ تحقیقات ونشریاتِ اسلام'' (Academy of Islamic Research and Publication) کے نام سے عمل میں آئی۔ اس نے پہلی کتاب ''مقالاتِ سیرت'' مصنفہ ڈاکٹر محمد آصف قدوائی کے نام سے شائع کی۔ ان سطور کی تحریر کے وقت تک اس کی مطبوعات کی تعداد ۱۶۸ تک پہنچ گئی ہے، اور کہا جاسکتا ہے کہ کم از کم انگریزی میں اس تحتی براعظم میں کسی ادارے نے دعوتی وعلمی انداز اور اچھی اور معیاری انگریزی میں دین وشریعت، عقائد وشریعت، عقائد اور ارکانِ اسلام، حدیث وسنت، سیرتِ طیبہ، خلفائے راشدین، اور تاریخِ اصلاح وتجدید، نیز ہندستان میں اسلام اور مسلمان کے تعمیری ودفاعی کاموں کے تعارف میں اس سے زیادہ لٹریچر شائع نہیں کیا۔ یورپ، امریکہ اور جنوبی افریقہ اور عرب ممالک میں اس کی کتابیں بحمداللہ بہت مقبول ہیں۔ یہ سب کام محض تائیدِ الٰہی سے ایسے تھوڑے سرمایے اور ایسے محدود عملے کے ذریعے وجود میں آیا جس پر آسانی سے یقین کرنا مشکل ہے''۔ (کاروانِ زندگی ج ۴/۴۵۲-۴۵۴)

لاریب حضرت مولاناؒ کو پوری دنیا کی امتِ مسلمہ سے نہایت ہی قلبی اور روحانی تعلق تھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان صراطِ مستقیم پر قائم رہیں اور دنیاوی وجاہت کو اسلام پر کسی حال میں بھی ترجیح نہ دیں۔ ان کو یہ بھی احساس تھا کہ مسلمان اپنے ایمانی طریقے اور عقیدے کے ستھرے پن سے دور ہوگیے ہیں۔ دنیا کی مادی تہذیبوں اور تمدنی فلسفوں کا اثر بڑی حد تک قبول کرنے لگے ہیں۔ وہ مادی مال ومتاع کی بھول بھلیوں میں پہنچ کر اپنے عقیدے اور ایمان سے کسی حد تک بیگانہ ہوگیے ہیں۔ انھوں نے مختلف اسلوب وانداز کے ساتھ امتِ مسلمہ کو خواہ عرب ہو یا عجم، ہر جگہ مخاطب کیا، اور ان کو اپنا منصبِ قیادت، اور اپنی عظمتِ رفتہ کا احساس دلایا۔ وہ ہر اس تحریک اور دعوت کے مؤید اور اس سے منسلک تھے، جو اسلام کی سربلندی، اعلائے کلمۃ اللہ اور مسلمانوں کو ان کے منصبِ قیادت وہدایت کی طرف لے جاتی ہو، اور دین ودنیا کے بارے میں اس کا موقف واضح ہو۔ ہندستانی مسلمانوں کے لیے ان کے وسیع قلب میں بڑی گنجائش تھی اور وہ ان کے مستقبل کے لیے بے حد فکرمند تھے۔ ان کی آنے والی نسلوں کے لیے دین پر باقی رہنے کی بے چینی ان کے رگ وریشے میں سرایت کرگئی تھی۔ وہ دینی تعلیمی کونسل کے ذریعے سے آنے والی نسلوں کے بنیادی عقائد اور ان کے ایمان بالغیب کی حفاظت کے لیے ہمہ وقت بے چین رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ہم نے اس اہم ترین پہلو کو بے توجہی کا شکار بنادیا تو مسلمان بچوں کو عقیدۂ توحید ورسالت، حساب وکتاب اور آخرت کی زندگی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہوسکے گا۔ اور ان کے

اور غیر مسلم نسل کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہ پائے گا۔ ان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بارے میں تو شاید ہی کچھ معلوم ہو، لیکن بتوں کے آگے جھکنے اور دیوی دیوتاؤں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہونے کے بارے میں سب کچھ معلوم ہوگا۔ اس صورتِ حال کو روکنے کے لیے جو مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے، بچوں کی دینی تعلیم کی طرف توجہ کرنے کی انتہائی ضرورت اور وقت کا سب سے بڑا تقاضا۔

ان کا خیال تھا کہ اگر انبیائے کرام بھی اپنی نئی نسلوں کے دین وایمان کی فکر نہ کریں تو وہ بھی غفلت کا شکار ہوسکتی ہیں۔ یہی جذبہ تھا جس کی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنی وفات سے قبل اس بات کا اطمینان کر لینے کا اتنا شدید تقاضا تھا کہ میری اولاد میرے نہ رہتے ہوئے کس چیز کی عبادت کرے گی۔ حالانکہ اولاد کے بارے میں کوئی شبہ نہ تھا کہ والد کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی اولاد کو جمع کرکے پوچھا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟ اولاد نے یک زبان ہوکر عرض کیا کہ اسی اللہ کی عبادت کریں گے، جس کی عبادت آپ اور آپ کے آباء واجداد اور اولیائے کرام کیا کرتے تھے۔ قرآنِ کریم میں ہے:

﴿أم كنتم شهداء إذ حضر يعقوب الموت ، إذ قال لبنيه : ما تعبدون من بعدي ؟ قالوا : نعبد إلهك و إله آبائك إبراهيم و إسماعيل و إسحاق إلهًا واحدًا و نحن له مسلمون﴾۔

ترجمہ: ”کیا حضرت یعقوب کے انتقال کے وقت تم موجود تھے، جب انھوں نے اپنی اولاد کو کہا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے تو سب نے جواب دیا کہ آپ کے معبود کی، اور آپ کے آباء واجداد ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام کے معبود کی، جو معبود ایک ہی ہے اور ہم اس کے فرماں بردار رہیں گے“۔

حضرت مولانا اکثر اپنی تقریروں میں اس آیت کو پڑھ کر بڑے درد سے فرمایا کرتے تھے کہ ہماری اولاد اور آنے والی نسلوں کو دین پر باقی رکھنے اور اللہ کی عبادت پر ثابت قدم رکھنے ہی میں ہمارے مسائل کا حل موجود ہے۔ انھوں نے ہندستانی مسلمانوں کو مخاطب کرکے کہا تھا:

”کسی ملک کے مسلمانوں کا خواہ وہاں مسلمان اکثریت میں ہوں، یا اقلیت میں، اولین واہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے بالغین کی دینی واقفیت اور بچوں کی دینی تعلیم کا کیا بندوبست کیا ہے؟ میں اپنے محدود مطالعے اور دینی واقفیت کی بنا پر یہ عقیدہ رکھنے پر مجبور ہوں کہ یہ مسئلہ ان کے تمام قومی مسائل سے مقدم اور اہم ہے۔ یہ ان کی زندگی کا بنیادی مسئلہ ہے۔ یہ ابدی نجات یا اس کی ہلاکت کا سوال ہے۔

ایک ایسے ملک میں بھی جہاں کوئی متوازی اور جارحانہ نظامِ تعلیم موجود نہ ہو، جہاں بچوں کی سادہ تختی پر اسلامی تعلیم کے نقوش ثبت کرنے کی پوری سہولت اور گنجائش ہو، یہ مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ مسلمان اپنے بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام اور اپنی آئندہ نسلوں کے اسلام پر قائم رکھنے کا اطمینان حاصل کرنے کے ذمہ دار ہیں، اور ان کو ایک دن کی تاخیر اور ایک لمحے کے التوا کے بغیر وہ تمام تدبیریں اور وسائل اختیار کرنے چاہئیں جو اس مقصد کے حصول کے لیے مفید اور ضروری ہوں۔

لیکن اس ملک میں ان کی ذمہ داری دوہری اور نہایت شدید ہوجاتی ہے، جہاں لازمی طور پر کوئی ایسا نظامِ تعلیم ونصابِ تعلیم جاری ہو جو اسلام کے بالمقابل عقائد کی تعلیم دیتا ہو اور جس کے مضامین اور مندرجات توحید و رسالت کے بنیادی اسلامی عقائد کے منافی اور شرک و گمراہی کے علانیہ داعی اور مبلغ ہوں، جہاں مسلمان بچے بھی کسی دوسری مذہبی قوم کی دیومالا (Mythology) پڑھنے پر مجبور ہوں، جس کا یقین کرنے سے کوئی مسلمان تاویل وتکلف کے ساتھ بھی مسلمان نہیں رہ سکتا۔ جہاں مسلمانوں کی اس محبوب شخصیت کا جس کی محبت وتعظیم مسلمانوں کا ایمان ہے، تذکرہ وتعارف ایسے نازیبا اور خلافِ واقعہ انداز میں کیا جائے، جس کا پڑھنا مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی روحانی اذیت اور ایمانی خطرہ ہے۔ جہاں قوموں کی تاریخی شخصیتوں کو ایسے حقیر وداغ دار طریقے پر پیش کیا جائے کہ مسلمان بچوں میں حقارت اور اپنے ماضی سے نفرت پیدا ہو۔ جہاں مسلمانوں کو جو اس ملک کے برابر اور ہندستانی جمہوریہ کے ایک ضروری عنصر ہیں، ان الفاظ سے یاد کیا جائے جو نیچ ذات اور ملچھ اقوام کے لیے بولے جاتے ہیں، ایسے حالات میں مسلمانوں پر دوذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ایک اس نامناسب صورتِ حال کی اصلاح وتبدیلی کی کوشش، دوسرے جب تک وہ قائم ہے، اس کے مضر اثرات سے حفاظت کا سامان، اور خواہ وہ قائم رہے یا دور ہوجائے، دونوں حالتوں میں مسلمان بچوں کی تعلیم کا مستقبل بندوبست''۔ (کاروانِ زندگی: ۱۹۴-۱۹۶)

ہندو پاک جنگ، بنگلہ دیش کا قیام اور حالات کی بے رحمی، مایوسی کا دور دورہ، اسلامی تشخص کے خاتمے کا اندیشہ اور قومی دھارے میں ضم ہوجانے کے اشارات، ان تمام باتوں نے مسلمانوں کی شخصیت کو مجروح کرنے اور ان کے مستقبل کو تاریک بنانے کے لیے منفی کردار ادا کرنا شروع کیا، سیاسی موقع پرست لوگوں نے ایک طرف مسلمانوں کا استحصال کیا اور دوسری طرف حکومتوں کی ہاں میں ہاں ملا کر ان کو ان کے آئینی حق سے تنازل پر آمادہ کرنے کی کوششیں کیں، یہ ایک ایسا عجیب وغریب اور نازک دور تھا کہ اگر اس کا تدارک نہ کیا جاتا تو مسلمان ہمیشہ کے لیے درجۂ دوم کے شہری بن کر رہ جاتے، نہ ان کی کوئی آواز ہوتی، نہ کوئی وزن ہوتا اور نہ ان کو اپنے حقوق کا علم ہوتا۔

اس لیے صورتِ حال نہایت نازک تھی، علمائے غیور ان حالات کو بنظرِ غائر دیکھ رہے تھے اور مستقبل کے تاریک آثار بھی نظر آرہے تھے، اس لیے ان کا بے چین ہونا اور کوئی ایسا لائحۂ عمل تیار کرنا نہایت ضروری تھا جو مسلمانوں کے اندر اعتماد کی فضا پیدا کرسکے، اور ان کے دلوں میں ایمان ویقین کی کھوئی ہوئی روشنی واپس آجائے، اور وہ اپنے آپ کو اس ملک کا ایک اہم عنصر تسلیم کرنے لگیں اور جو باتیں ان کے دین وایمان اور ان کی شریعت کے اصولوں کے خلاف ہوں، ان کو قبول کرنے سے نہایت جرأت کے ساتھ صاف صاف انکار کردیں، جہاں بت پرستی کا شائبہ ہو، وہاں سے دور بھاگنے ہی میں عافیت سمجھیں، جہاں قومی دھارے کا مطلب اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی ہو، جہاں اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے ہوئے ہچکچاہٹ اور شرم محسوس کی جائے، ان تمام باتوں اور جگہوں کو دور سے سلام کرنا اپنا مذہبی فرض گردانا جائے۔

ان حالات میں اگر علمائے کرام نے ایک مشترکہ

مجلس کے قیام کا فیصلہ نہ کیا ہوتا تو نہ صرف متاعِ ایماں لُٹ جانے کا خطرہ تھا، بلکہ اس ملک میں اندلس کی تاریخ دہرانے کا منصوبہ کامیاب ہوجاتا، اور مسلمانوں کو مذہب چھوڑ کر بت پرست اور مشرک بن جانے کا حکم دیا جاتا۔ یہ وقفہ بہت ہی نازک اور تیز رفتار تبدیلی لانے کا متقاضی تھا، ایک مذہبی وحدت قائم کرکے سول کوڈ جیسے ناپاک منصوبوں کو بروئے کار لانے کے عمل کو پسپا کرنا سب کا مذہبی فرض تھا، اگرچہ بہت سے ضمیر فروش مسلمان شریعت کے اندر تبدیلی لانا اور چودہ سو سال کے دینی مزاج کو بدلنا ضروری سمجھنے لگے تھے، اور قومی دھارے میں شامل ہوجانے کی آوازیں بلند ہورہی تھیں، وجودِ مسلم برف کی طرح پگھل جانے کے خطرے سے دوچار تھا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی، اور ہمارے علمائے کرام کو توفیقِ کامل نصیب ہوئی کہ وہ مسلم عائلی قانون کے تحفظ کی راہ میں ہر قربانی کے لیے تیار ہوجائیں، میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلے میں علما کی جماعت میں سب سے زیادہ جو لوگ متفکر تھے، وہ بزرگانِ دین تھے، جو ان ناپاک منصوبوں اور خطرات کا مشاہدہ کررہے تھے، ان کی آہِ سحرگاہیاں، ان کا اللہ کے حضور میں دین کی تقویت کے لیے دستِ سوال دراز کرنا، اسلام اور مسلمانوں کی عزت کے لیے اللہ سے بھیک مانگنا، اس کے لیے علما کی ایک جماعت کھڑی ہوگئی۔ حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ، حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ پیش پیش رہے، اور وہ بزرگوں اور خواص کے مشورے سے جمع ہوئے اور اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے انھوں نے ایک اجتماع مرتب کیا، اور ۲۷-۲۸/دسمبر ۱۹۷۲ء کو ممبئی میں مسلم پرسنل لا کنونشن میں ہر مکتبِ خیال کے نمائندوں اور تمام مذہبی فرقوں اور جماعتوں کو دعوت دی کہ اس فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے متحدہ محاذ قائم کیا جائے۔ اس کنونشن میں محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پوری ملتِ اسلامیہ ہندیہ کی پورے جوش و خروش کے ساتھ مکمل نمائندگی ہوئی۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کنونشن میں شریک ہونے والے حضرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ملتِ اسلامیہ ہندیہ کی ایسی مکمل نمائندگی اس سے پہلے کم دیکھنے میں آئی تھی، شرکا میں بریلوی مکتبِ خیال کے عالم و قائد مولانا برہان الحق جبل پوری، اثنا عشری فرقے کے نمائندے مولانا کلبِ عابد صاحب، بوہرہ فرقے کے نمائندے اور ذمہ دار ڈاکٹر نجم الدین، اہلِ حدیث حضرات کے متعدد مقتدر علما و زعما شریک تھے۔ رات کو مدن پورہ کے وائی۔ ایم۔ سی۔ کے میدان میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا، جس میں ایک لاکھ کے قریب مجمع ہوگا۔ متعدد عالمانہ و مفکرانہ تقریریں ہوئیں، بمبئی بلکہ مہاراشٹر کے مسلمانوں نے بڑی گرم جوشی سے اس مقصد کے ساتھ تعاون کیا، اور بڑی فراخ دلی سے میزبانی کے فرائض انجام دیئے۔ ایک آل انڈیا بورڈ کی تشکیل ہوئی، جس کے صدر بالاتفاق حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند اور جنرل سکریٹری مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی قرار پائے، اور اس طرح اس مبارک مہم کا آغاز ہوا، جو مسلمانوں کے لیے (دینی و شرعی نقطۂ نگاہ سے) موت و حیات کا مسئلہ ہے، اور یہ جد و جہد ابھی تک جاری ہے"۔ (کاروانِ زندگی ج ۲/۱۳۸)

اُس مسلم پرسنل لا کی عملی تنفیذ اور اس کے بقا و استحکام

کے لیے ماہرینِ شریعت اور ماہرینِ قانون پر مشتمل ایک بورڈ بنایا گیا۔ اُس کے پہلے صدر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب بالاتفاق منتخب ہوئے، اور اس کے سکریٹری جنرل حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی قرار پائے۔ حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کے بعد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ بورڈ کے صدر ہوئے اور تاحیات اس کے صدر باقی رہے۔ بورڈ میں ان حضرات کے بعد سب سے نمایاں شخصیت حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔ انھوں نے حضرت مولانا کی وفات کے بعد صدر کا عہدہ سنبھالا اور باوجود اپنی علالت اور کمزوری کے آخری سانس تک بورڈ کی خدمت مختلف طریقوں سے انجام دیتے رہے۔ ان کی جماعت کے خاص افراد میں جناب مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی، اپنے علم وفضل اور وسعتِ نظر کے اعتبار سے بہت اہم رکن تھے اور آج بھی وہ اسی اہمیت کے ساتھ بورڈ کی خدمت میں مصروف ہیں۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایمانی بصیرت اور روشن ضمیری سے اہلِ وطن کو اسلام سے قریب لانے اور ان تک اسلام کا پیغام پہنچانے کے لیے ''پیامِ انسانیت'' کے نام سے ایک دعوتی تحریک کی بنیاد ۱۹۵۵ء میں ڈالی تھی، اور اس کے حلقے کو حکمت وتدبر کے ساتھ برابر وسیع فرماتے رہے، ملک کے مختلف بڑے شہروں اور مرکزی مقامات پر اس کے جلسے کیے جاتے تھے اور اس میں غیر مسلم دانشوروں اور تعلیم یافتہ طبقے کو خاص طور سے دعوت دی جاتی تھی اور عام جلسے کے علاوہ ان حضرات کی ایک خصوصی نشست بھی رکھی جاتی تھی جس کو حضرت مولانا خود خطاب فرماتے تھے، اور دعوت کی حکمت کو پیشِ نظر رکھ کر ان کو بغیر کسی صراحت کے اسلام کی اعلیٰ اخلاقیات کی طرف متوجہ فرماتے تھے، جس کا بے حد گہرا اثر پورے مجمع پر پڑتا تھا، اور لوگ حضرتِ والا کی وطن دوستی اور خدمتِ خلق اور انسانیت کے احترام کا جذبہ جو اُن کے اندر موج زن تھا، اس کا لوہا ماننے پر مجبور ہوتے تھے۔

۲۲ر جنوری ۱۹۵۴ء میں حضرت مولانا نے غازی پور ٹاؤن ہال میں پیامِ انسانیت کے ایک جلسے میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

'' جنگی تاریخیں صاف بتلاتی ہیں کہ بجز ہوس کی آگ، نفس کی آگ اور پیٹ کی آگ بجھانے کے اور کوئی اہم مقصد حکومتوں کے سامنے نہیں رہا، کسی سیارے اور کسی مریخ سے کوئی دشمن نہیں اترا، باہر سے کوئی ستانے کے لیے نہیں آیا، کسی دوسرے ملک سے بھی ہمیں تباہ کرنے کے لیے کوئی نہیں آیا، بلکہ جو کچھ ہماری مصیبتیں ہیں، وہ ہمارے ہی ہاتھوں کی لائی ہوئی اور ہماری اخلاقی پستی کا نتیجہ ہیں۔

آپ سے پہلے جو قومیں دنیا میں تباہ ہوئیں، ان پر کسی مرض یا وبا سے تباہی نہیں آئی، بلکہ وہ اپنی اخلاقی خرابی، دولت پرستی اور کیرکٹر کی گراوٹ سے تباہ ہوئیں، سیاسی پارٹیاں چاہے جو مرض اور بیماری بتلائیں، میں تو یہی کہتا ہوں کہ اصل بیماری انسانیت کی تباہی اور اخلاقی پستی ہے''۔ (خطباتِ علی میاں ج ۲/۸۳-۸۴)

کلکتہ میں مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن میں ۲۳ر مئی ۱۹۷۲ء کو حضرت مولانا کا خطاب ہوا۔ اس میں شہر کے تعلیم یافتہ افراد کے علاوہ مدارس وجامعات کے طلبہ واساتذہ موجود تھے۔

حضرت نے فرمایا:

''زبانیں انسانوں کے لیے بنی ہیں، انسان زبانوں کے لیے نہیں بنے ہیں۔ ایک انسانی جان کی قیمت زبان وادب کے پورے ذخیرے، ہزاروں ادبی شاہ کاروں، شعروشاعری کے ہزاروں دفتروں اور فصاحت وبلاغت کے دریاؤں اور سمندروں سے زیادہ ہے، زبانیں پیدا ہوئیں، اور مٹیں، سکڑیں اور پھیلیں۔ ان میں ہزاروں تبدیلیاں ہوئیں، لیکن انسان سدا سے انسان ہے اور ہمیشہ انسان رہے گا۔

دوستو! ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ہم نے دینی جذبۂ عبادت کا ذوق اور دینی معلومات کی ترقی کی جتنی کوشش کی، اتنا شعور صحیح اور بیدار کرنے کی کوشش نہیں کی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بہت سے اسلامی ملکوں میں عمل اور شعور میں وہ تناسب نہیں جو ہونا چاہیے۔ ایک آدمی آپ کو بڑا دین دار، عابد و تہجد گذار ملے گا، لیکن اس کا دینی شعور بالکل ناپختہ اور طفلانہ ہوگا۔ بعض مرتبہ وہ دین کے بنیادی تقاضوں سے ناواقف نظر آئے گا، اور وہ ایسی غلطی کر بیٹھے گا جو کسی صاحبِ شعور مسلمان سے حد درجہ مستبعد ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ جاہلیت اور اسلام کا بالکل فرق نہ سمجھتا ہو، اور وہ نہایت آسانی کے ساتھ کسی جاہلی دعوت اور کسی عیار وشاطر کا شکار ہوجائے، اور وہ اس کو اپنے مذموم مقاصد اور اسلام کی بیخ کنی کے لیے استعمال کرے، ہوسکتا ہے کہ وہ نیک نیتی اور سادگی کے ساتھ اس کام کو انجام دے، اور اس عمل میں اور دین کے تقاضوں میں اس کو کوئی تضاد محسوس نہ ہو۔ تاریخ اسلام میں اس کی بہت سی مثالیں ملیں گی''۔

(خطباتِ علی میاں ج ۲/ ۱۱۹)

حضرت مولاناؒ نے انسانیت کے بگاڑ کو بیان کرتے ہوئے کہا:

''دوستو! انسانیت کے مسائل اور مشکلات کا حل نہ لباس کی یکسانی ہے، نہ زبان اور تہذیب کا اشتراک، نہ ملک ووطن کی وحدت، نہ علم ودولت، نہ تہذیب وتنظیم، نہ وسائل وذرائع کی کثرت، ان سب میں کوئی ایک بھی ایسی طاقت نہیں، جو دنیا کو بدل دے، جب تک دل کی دنیا نہیں بدلتی، باہر کی دنیا نہیں بدل سکتی، پوری دنیا کی باگ ڈور دل کے ہاتھ ہے۔ زندگی کا سارا بگاڑ دل کے بگاڑ سے شروع ہوا ہے۔ لوگ کہتے ہیں مچھلی سر کی طرف سے سڑنا شروع ہوتی ہے، میں کہتا ہوں: انسان دل کی طرف سے سڑتا ہے۔ یہاں سے بگاڑ شروع ہوجاتا ہے اور ساری زندگی میں پھیل جاتا ہے۔

پیغمبر یہیں سے اپنا کام شروع کرتے ہیں، وہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ سب دل کا قصور ہے۔ انسان کا دل بگڑ گیا ہے، اس کے اندر چوری، ظلم، دغابازی کا جذبہ اور ہوس پیدا ہوگئی ہے۔ اس کے اندر خواہش کا عفریت ہے، جو ہر وقت اس کو نچا رہا ہے، اور وہ بچے کی طرح اس کے اشارے پر حرکت کر رہا ہے۔ پیغمبر کہتے ہیں کہ ساری خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ انسان پاپی ہوگیا ہے۔ اس کے اندر برائی کا جذبہ اور اس کا زبردست میلان پیدا ہوگیا ہے۔ اس کے لیے سب سے ضروری اور مقدم کام یہ ہے کہ اس کے دل کی اصلاح کی جائے اور اس کے من کو مانجھا جائے''۔

(خطباتِ علی میاں ج ۲/ ۲۱۶)۔☆☆☆☆

خطباتِ مدراس
اور انسانیت کا ادراک

مولانا عمیر الصدیق ندوی

انسانیت ، انسان کے وجود سے ہے اور انسان کا وجود دوسری تمام مخلوقات سے اس لیے غور وفکر کا موضوع بنتا ہے کہ انسان میں احساس وادراک اور ارادے کی صفات ہیں اور یہی خوبیاں انسان کو ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے کارآمد ہیں جن سے انسانیت عبارت ہے۔

آج سے قریب نوے سال پہلے اسی مدراس میں اسی انسانیت کی اصل خدمت یعنی انسان کو اپنے انسان ہونے اور انسان ہونے کے ناطے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے اور احساس کو عقل وذہن کی مدد سے عمل میں لانے اور اس پورے عمل کی کامیابی کے لیے سب سے بہتر نمونے کو سامنے رکھنے کی وہ باتیں کی گئی تھیں جنھوں نے مدراس کے نام کو صرف اُردو ہی نہیں، عالمی پیمانے پر علمی حلقوں کے لیے مانوس وآشنا ہی نہیں، ایک انفرادی عزت واہمیت بھی دلادی۔

یہ ۱۹۲۵ء کے اکتوبر ونومبر کی بات ہے جب مدراس کی اسلامی تعلیمی انجمن نے دارالمصنفین بلکہ دنیائے مصنفین کے گلِ سرسبد مولانا سید سلیمان ندویؒ کو سیرتِ نبوی پر خطبات کے لیے دعوت دی تھی ، دعوت دینے والے سیٹھ ایم جمال محمد تھے جن کی بڑی صفت ان کی وہ فیاضی تھی جس سے اس وقت مدراس کی تعلیمی درس گاہیں سیراب ہورہی تھیں۔ اس وقت مدراس میں کوئی لالی ہال تھا، اب خدا جانے وہ کس شکل میں ہے ، اسی لالی ہال میں سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے انسانیت کے لیے محسنِ انسانیت کی حیاتِ طیبہ کا ایسا عطر پیش کیا جس کی خوش بو قریب ایک صدی سے پھیلی اور پھیلتی جارہی ہے۔ ''خطباتِ مدراس'' اسی عطرِ مجموعہ کا نام ہے۔

'' خطباتِ مدراس '' میں محسنِ انسانیت کے احسانوں کا ذکر آج ٹھیک اسی طرح ضروری ہے جتنا قریب ایک صدی پہلے تھا۔ سیٹھ جمال محمد نے خطباتِ اسلامیہ مدراس کا ایک وسیع تر منصوبہ تیار کیا تھا جس کے متعلق سید صاحب نے فرمایا تھا کہ یہ سلسلہ یورپ کے مشہور خطبات کے سلسلوں کی طرح بہت مفید اور شہرت پذیر ہوگا۔ یہ پیش گوئی سلسلے کے دوسرے خطبات کے ذریعے کس طرح پوری ہوئی ؟ اس کے جواب سے قطعِ نظر یہ کہنا ہی کافی ہے کہ صرف خطباتِ مدراس ہی اس کا مصداق بن گئی۔

خطباتِ مدراس کی معطر فضاؤں میں چند لمحات

گزارنے سے پہلے، خود مدراس میں سید صاحب کی یادوں کو تازہ کرنے کا بھی آج موقع ہے۔ معارف میں سید صاحب نے مدراس کا پہلی بار اگست ۱۹۱۸ء میں اس وقت ذکر کیا جب تحریکِ ندوۃ العلما کے زیرِ اثر مجلسِ علمائے جنوبی ہند یہاں قائم ہوئی۔ مدراس کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ ہندستان کے دوسرے اسلامی صوبوں کے برعکس مدراس میں اسلامی سرمایے کی کمی نہیں وللہ الحمد۔ لیکن جب وہ ۱۹۲۵ء میں مدراس آئے تو انھوں نے یہاں کے حالات کا غائرانہ مشاہدہ کیا۔ اس کا بیان خاصا طویل ہے مگر اس میں انھوں نے مدرسہ جمالیہ کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا کہ یہاں سیرۃ النبی (ﷺ) کے تاملِ ترجمے کا کام ہو رہا ہے اور مدراس میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نظم و نثر اردو میں شمالی ہند کے لوگوں سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ بھی لکھا کہ اشاعتِ اسلام کا یہاں بڑا میدان ہے۔ ان کو یہاں کے حالات دیکھ کر سعدیؔ کا مشہور شعر یاد آ گیا کہ

کریما را بدست اندر درم نیست
خداوندانِ نعمت را کرم نیست

یعنی جہاں کام ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے، وہاں روپیہ نہیں، اور جہاں روپیہ ہے وہاں کام نہیں۔ انھوں نے یہاں کے چند کتب خانوں کا ذکر کیا کہ ان میں عربی فارسی کی دو ہزار قلمی کتابیں ہیں اور بعض تو نادر و نایاب ہیں جن میں ملا جامیؔ کی وہ شرح بھی ہے جو اصل مسودے سے تیسری نقل ہے۔ اس کے علاوہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے خاندان کی بھی بعض کتابیں ہیں۔ وہیں یہ بھی لکھا اور شمالی ہند کے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے لکھا کہ اگر کچھ کرنا چاہتے ہیں تو مدراس وغیرہ جائیے۔ سید صاحب سوا مہینے اسی مدراس میں قیام پذیر رہے اور اسی دورانِ قیام انھوں نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے متعلق آٹھ خطبے دیئے۔ انھوں نے مدراس کے جن احباب کا شکریہ ادا کیا، ان میں سیٹھ حیدر حسن، یعقوب حسن وغیرہ کئی نام ہیں۔ پروفیسر عبدالحق اور مولوی عبدالرحمٰن شاطرؔ کا بھی نام ہے۔ خدا جانے ان کے وارثین آج کہاں ہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ خطباتِ مدراس نے مولانا سید سلیمان ندوی، ندوۃ العلما اور دارالمصنفین کا تعلق ہمیشہ کے لیے قائم کر دیا اور آج یہ اسی کا فیض ہے کہ ایک صدی بعد جب انسانیت پہلے سے زیادہ شیطانیت کے نرغے میں ہے، ایک بار پھر مدراس کی سرزمین سے علم و ادب کے حوالے سے انسانیت کو زندہ کرنے، زندہ رکھنے اور زندہ رہنے کی مبارک ترین کوشش ہمارے سامنے ہے۔ اس موقعے پر ''خطباتِ مدراس'' کے پیغام کو از سرِ نو تازہ کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔

دراصل انسان کے علم و فن، اس کے ادب و شعر کی غرض و غایت بلکہ معراج یہی ہے کہ اس کے ذریعے انسانیت کے اصل مقام پر نظر رکھ کر انسانوں کو اس کی جانب توجہ دلائی جائے اور اس طرح ادب جو انسان کی فطرت و سرشت میں داخل ہے، اس کو صحیح سمت اور جہت پر گامزن رکھنے کی ذمہ داری ادا کی جائے۔

خطبات میں سید صاحب نے اسی ادائے فریضہ کو غالباً سامنے رکھ کر کہا کہ عدل اور علم جو بالفعل انسان کو حاصل نہیں، ان کو حاصل کرنے کے لیے اس کی عملی قوت میں عدل

یعنی میانہ روی اور اعتدال اور ذہنی قوت میں علم اور معرفت کی ضرورت ہے۔ یہ دراصل سورۃ العصر کی ترجمانی تھی کہ انسانیت اس وقت تک گھاٹے اور ٹوٹے میں ہے جب تک اس کو اپنے نظریے پر یقین یعنی ایمان اور نظریات کے پیش کرنے میں اعتدال یعنی مناسب ترین طرزِ عمل حاصل نہ ہو۔ ادب میں اگر تمام آسمانی صحیفے ، تمام مذہبی کتابیں، تمام اخلاقی قصے اور انسانوں کے بننے بگڑنے کی تمام حکایتیں ظلم و جہل اور ایمان و عملِ صالح کی دورنگیوں سے معمور ہیں اور یقیناً معمور ہیں تو یہ سب انسان کی خوش بختی، خوش حالی اور خوش انجامی ہی کے لیے تو ہیں۔ آخر دنیا کے اسٹیج پر ہزاروں انسانی زندگیوں کے نمونے ہیں۔ فوجیں، دانش ور، فلاسفر، فاتحینِ عالم، شعرا سب اسی اسٹیج پر نمودار ہوتے رہے۔ سرمایہ داروں کی چمک بکھرتی رہی لیکن انسانیت اس اسٹیج کے اداکاروں کو دیکھ کر یہی کہتی رہی کہ ان میں سے کس کی زندگی خود انسانوں کی خوش بختی کے لیے ہے؟ کون ہے جو اصل کامیابی کی ضامن ہے؟ اور کون ہے جس کو انسانیت اپنے تقاضوں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ بنائے؟ کن لوگوں نے انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی نمونہ چھوڑا؟ وہ جو مانے ہوئے شمشیر زن تھے، کیا جنگ کے میدان کی طرح انھوں نے انسانی اوہام اور باطل و فاسد خیالات کی بیڑیاں بھی کاٹیں؟ انسانوں کے باہمی برادرانہ تعلقات کی گتھی بھی انھوں نے سلجھائی؟ انسانی معاشرت کا کوئی خاکہ بھی انھوں نے پیش کیا؟ کیا انسان کی روحانی مایوسیوں اور ناامیدیوں کا انھوں نے کوئی علاج پیش کیا؟ کیا دلوں کی ناپاکی اور زنگ دور کرنے کی تدبیر بھی کی یا انسانیت کو جو اخلاق اور اعمال مطلوب ہیں، ان کا وہ کوئی نقشہ پیش کر سکے؟۔

کیسے کیسے شاعر پیدا ہوتے رہے، خیالوں کی کون سی دنیا انھوں نے تاراج نہیں کی، آسمان و زمین کے قلابے ملانے میں، تخیل و محاکات میں ان سے کون سی کمی ہوئی لیکن فوری جوش اور خیالی لذت و الم کی افزائش کے سوا وہ نسلِ انسانی کو اس کی زندگی کی مشکلات دور کرنے کا کون سا صحیح مشورہ دے سکے، دیتے بھی کیسے کہ شیریں زبانی کے پیچھے حسنِ عمل کا کوئی خوش نما نمونہ ان کے ذریعے ظاہر ہی نہیں ہوا۔

فلاسفہ اور دانش وروں نے اپنی عقلِ رسا کے حیرت ناک کرشمے دکھائے ، کیسے کیسے حیرت انگیز نظریے ان کے ذریعے وجود میں آئے لیکن انسانیت کے نظامِ ہدایت کا وہ کوئی عملی نقشہ پیش نہ کر سکے، نہ انسانوں کے فرائض کی طلسم کشائی میں کوئی عملی مدد دے سکے، تاریخ تھک گئی لیکن دانش وروں اور فلسفیوں کی چناں چنیں کے نتیجے میں کتنے انسان' انسانیت کی اصل منزل کی یافت میں کامیاب ہوئے، اس کا سُراغ یہ تاریخ نہ لگا سکی۔ ایسا کیوں ہوا؟ جواب یہی ہے کہ فلسفیانہ رموز و اسرار کا دائرۂ اثر ان فلسفیوں کے کمروں اور لکچروں تک محدود رہا۔ ان سے باہر ان کا اثر اس لیے نہیں پھیلا کہ یہ سارے نظریات عمل کی دنیا سے پرے تھے۔ ان لوگوں کی عملی زندگی عام انسانی افراد سے ایک انچ بھی بلند نہ ہوئی۔ وہ یہ نکتہ بھول گیے کہ انسان کانوں سے نہیں، آنکھوں سے بنتا ہے۔ حکمرانوں اور بادشاہوں کو نمونہ پیش کرنے کا سب سے زیادہ موقع اور حق تھا، انھوں نے آبادیوں کے مجرموں کو روپوش بھی کیا لیکن تنہائیوں اور حکومت خانوں کے روپوش مجرموں کو وہ بھی باز نہ

رکھ سکے۔ بازاروں اور راستوں میں امن قائم کیا لیکن کیا دلوں کی بستی میں وہ امن و امان قائم کرنے میں کامیاب ہوئے؟ ملک کا نظم و نسق درست کیا لیکن روحوں کی مملکت بھی ان سے درست ہوئی؟۔

قانون ساز تو بادشاہوں سے بڑھ کر ہوئے لیکن ان کے قانون کیا انسانوں کے لیے بنے یا صرف حکومتوں کی خاطر بنے؟۔

صفِ انسانی کے یہ وہ طبقے ہیں جن کو بڑائی کا دعوی کرنے کا حق ہے لیکن کیا انسانیت کا حق ادا کرنے کا دعوی ان کو زیب دیتا ہے؟۔

''خطباتِ مدراس'' کے آٹھوں خطبوں نے ان سوالات کا جواب جس طرح دیا اور محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، عالم گیریت، تاریخیت، کاملیت، جامعیت، عملیت کے عنوانوں سے دیا، اس کی تفصیل کی یہاں گنجائش ہی نہیں، لیکن ایک جوہر جوہر بحث کا حصہ ہے، وہ صرف انسانیت کی حیات، بقا اور دوام کی فکر ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کی جماعت اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں ان کی جامعیت سے یہی ثابت کیا گیا کہ انسانوں کی حقیقی بھلائی کی کامیاب کوششیں صرف اسی ایک طبقۂ انسانی نے انجام دیں۔

''خطباتِ مدراس'' میں پہلا ہی خطبہ تمام خطبات کی روح ہے، اور یہ روح وہی ہے جو انسانوں کی کامیابی کے لیے تڑپتی ہے۔ اس میں کہا گیا کہ انسانوں کی عمدہ معاشرت، صحیح تمدن اور اعلیٰ سیرت کی تکمیل میں اور انسانوں کو اشرف المخلوقات کا مرتبہ حاصل کرانے میں یقیناً تمام کارکنان طبقاتِ انسانی کا حصہ ہے، مگر سب سے زیادہ ممنونیت ان کے لیے ہے جنھوں نے ہماری اندرونی دنیا کو آباد کیا، جنھوں نے ہماری حرص اور لالچ کی اندرونی چالیں درست کیں، ہماری روحانی بیماریوں کے نسخے ترتیب دیئے۔ ہمارے جذبات، احساسات اور ارادوں کے نقشے درست کیے۔ ہمارے نفوس و قلوب کے عروج و تنزل کا فن ترتیب دیا جس سے دنیا کے صحیح تمدن اور صحیح معاشرت کی تکمیل ہوئی۔ اخلاق و سیرت، انسانیت کا جوہر قرار پایا۔ نیکی اور بھلائی، ایوانِ عمل کے نقش و نگار ٹھہرے اور خدا و بندے کا رشتہ باہم مضبوط ہوا اور روزِ الست کا بھولا ہوا وعدہ انسان کو یاد آیا۔

'خطباتِ مدراس' کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ موضوع تو محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے لیکن مقصود محض انسانیت کی بازیافت ہے۔ ساتویں خطبے میں یہ بات روشن ہوگئی کہ بنیادی مسئلوں میں سب سے پہلا مسئلہ جو پیغامِ محمدی کے ذریعے سامنے آیا، وہ کائنات اور مخلوقاتِ الٰہی میں انسانیت کا درجہ ہے۔ اور یہی توحید کی جڑ ہے۔ وہ انسان جو اکثر مخلوقاتِ الٰہی سے اپنے کو کم درجہ اور کم رتبہ سمجھتا رہا، پیغامِ محمدی نے یہ بتایا کہ یہ چیزیں تمھاری آقا نہیں بلکہ تم ان کے آقا ہو، کائنات کا سرتاج تم ہو، اس توحید نے انسانیت کے درجے کو کہاں سے کہاں تک بلند کر دیا۔ یہ پورا باب انسانیت کی ان بلندیوں کو آشکار کرتا ہے جن سے آج کی دنیا نگاہیں پھیرے ہوئے ہے۔

کاش انسانیت اپنی تلاش کی فکر کرے۔ اس کوشش میں مدراس کے یہ خطبات شاید سب سے زیادہ مددگار ثابت ہوں۔ ☆☆☆☆

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی سیرت نگاری

ڈاکٹر احسان اللہ فہد (علی گڑھ)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ (۱۹۰۸-۲۰۰۲) کا تعلق حیدرآباد دکن سے تھا۔ وہیں انھوں نے ابتدائی سے اعلیٰ تعلیم تک کے مراحل طے کیے اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے ایم اے اور ایل ایل بی کی سند حاصل کی۔ پھر اپنی اُسی مادرِ علمی میں تدریس کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ تقسیمِ ملک سے کچھ قبل اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی تشریف لے گیے اور بون یونیورسٹی سے بین الاقوامی قانون کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈی فل کی سند حاصل کی۔

پروفیسر خورشید احمد مدیر ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' نے ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تعریف میں لکھا ہے کہ:

''میں نے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے ساتھ متعدد علمی مذاکرات میں شرکت کی ہے لیکن سب سے زیادہ یادگار وہ مخیم (تربیتی کیمپ) تھا جو فرانس میں ایک دیہاتی علاقے میں فرانس کی مسلمان طلبہ کی اسلامی تنظیم (UMSO) کے تحت منعقد ہوا تھا اور جس میں پانچ دن رات ہم نے ساتھ گزارے۔ ڈاکٹر صاحب بھی عام طلبہ کی طرح زمین پر سوتے اور اپنے برتن اپنے ہاتھ سے دھوتے تھے۔ مجھے یہ سعادت بھی حاصل ہوئی کہ کمالِ التفات سے ڈاکٹر صاحب نے میری تقاریر کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ فرمایا۔ وقت کی پابندی میں بھی ڈاکٹر صاحب اپنی مثال آپ تھے۔ اس کی کوئی دوسری مثال اگر میں دے سکتا ہوں تو وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ہے۔ یہاں اس واقعے کا ذکر بھی شاید غیر متعلق نہ ہو کہ حیدرآباد کا نوجوان حمید اللہ اپنی پوری طالبِ علمی کے دور میں صرف ایک بار کلاس میں تاخیر سے پہنچا (غیر حاضری کا تو سوال ہی نہ تھا) اور یہ وہ دن تھا جب ان کی والدہ کا انتقال ہوا۔ تدفین کے بعد یہ نوجوان سیدھا جامعہ گیا اور کلاس میں شریک ہوگیا''۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا سب سے اہم کارنامہ مسلمانوں کا بین الاقوامی قانون کے میدان میں ہے جس میں انھوں نے علمی دنیا سے یہ منوالیا کہ بین الاقوامی قانون کے اصل بانی مسلمان فقہا اور علما ہیں۔ سترہویں صدی کے مغربی مفکرین نہیں ہیں۔ اس کے لیے آپ نے فقہ اور تمام متعلقہ مصادر و مآخذ میں موجود مواد سے استفادے کے علاوہ اسلام کے بین الاقوامی قانون میں چند جدید اسلوب بھی متعارف کروائے۔ سیر یا اسلام کے بین الاقوامی قانون پر قدیم کتب میں پرائیویٹ بین الاقوامی قانون یا قوانین کے تصادم پر زیادہ مباحث نہیں ملتے۔ ملتے بھی ہیں تو ایک مرتب شعبۂ علم کے طور پر یکجا نہیں ملتے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع پر فقہ کی دوسری شاخوں سے مواد جمع کر کے اس شعبۂ قانون کو مدون کیا

اور قوانین کے تصادم کے اسلامی نظریے اور تصورات کو ایک مرتب اور مربوط نظریے کی صورت میں پیش کیا۔ اسلام کے بین الاقوامی قانون میں نئی نئی تحقیقات اور نئے نئے تصورات کو متعارف کرانے کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے متعدد اقوال اور اصولوں کی نئی تفسیرات اور جدید تشریحات بھی پیش کیں۔ انھوں نے قانونی اور فقہی اصول ونظریات اور تاریخی حقائق کو اس انداز میں پیش کیا کہ وہ ایک دوسرے کی تکمیل کرسکیں۔ یہ بلاشبہ آپ کا ایک لائقِ تحسین کارنامہ ہے۔ ابھی تک ''دا مسلم کنڈکٹ آف اسٹیٹ'' اسلامی قانون کے اس شعبے کی تدوینِ نو کی بہترین مثال ہے۔(۱)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی خدمات کا ایک اور اہم جز سیرت نگاری یا حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح نگاری ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابتدائے اسلام کی سفارت کاری کے موضوع پر مواد جمع کرتے وقت ان کو علمِ سیرت سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور پھر وہ بتدریج اس موضوع کی جانب منتقل ہوتے چلے گیے۔ اپنے علم وتحقیق کے ستر برسوں میں آخری ۳۵ برس کے دوران ان کی زیادہ تر توجہ سیرت ہی پر مرکوز رہی۔ ان آخری تین چار عشروں میں انھوں نے شاید ہی اسلام کے بین الاقوامی قانون پر مستقلاً کچھ تحریر فرمایا ہو۔ البتہ اپنی ابتدائی مطبوعات پر نئے اضافوں اور ان میں نئی معلومات اور نئے نتائج تحقیق کو شامل کرنے کا سلسلہ برابر جاری رہا، جس سے ان کے اس علمی کام کی وقعت میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔

سیرت پر ان کی پہلی کتاب ''عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی'' ہے۔ یہ کتاب ریاستِ مدینہ کے عدل وانصاف اور طرزِ حکمرانی پر لکھے جانے والے تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ اسے مدینہ کی شہری ریاست قرار دیتے ہیں۔ اس کے ابتدائی حصے میں مکہ کی شہری ریاست سے متعلق ایک فاضلانہ تحقیقی مقالہ بھی شامل ہے جو پہلی مرتبہ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرے مقالات ۱۹۳۰ء کی دہائی کے آخر میں اور ۱۹۴۰ء کی دہائی کے اوائل میں لکھے گیے۔ یہ کتاب پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نظامِ حکمرانی پر ڈاکٹر صاحب کا ابتدائی مگر انتہائی کام ہے۔ اس کتاب میں سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد پہلوؤں کو مطالعے اور تحقیق کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کتاب میں سیرت کے ان نئے پہلوؤں پر مواد کا ایسا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے جس سے قدیم سیرت نگاروں نے اعتنا نہیں کیا۔ اس کتاب کے تقریباً نصف درجن اڈیشن منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ہر اڈیشن میں اضافے اور نئے تحقیقی نتائج شامل ہیں۔

اس کتاب کا ایک چھوٹا سا جز جس نے بعد میں ایک مستقل بالذات کتاب کی حیثیت اختیار کی، میثاقِ مدینہ کے بارے میں ہے۔ میثاقِ مدینہ ایک ایسی اہم اور بنیادی دستاویز ہے جس سے قدیم سیرت نگاروں نے بحث زیادہ نہیں کی۔ ابن ہشام اور ابن اسحاق سے لے کر علامہ شبلی نعمانی اور قاضی محمد سلیمان منصور پوری تک سب نے اس دستاویز کا سرسری تذکرہ کرنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلی بار اس کتاب میں میثاقِ مدینہ پر مفصل گفتگو کی۔ ان مباحث کو پھیلا کر بعد میں انھوں نے ''دنیا کا پہلا تحریری دستور'' کے نام

سے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب تیار کی۔

سیرتِ پاک کے سیاسی پہلو پر ان کا ایک اور مجموعۂ مقالات ''رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی'' ہے۔ اس کتاب کی ترتیب و تدوین ایک طویل عرصہ (۱۹۳۵ء-۱۹۵۰ء) کو محیط ہے۔ اس کتاب میں شامل کیا جانے والا بیشتر مواد ان کی فرانسیسی کتاب سے ماخوذ ہے۔ یقیناً اس میں انتہائی اہم اضافے بھی کیے گیے ہیں۔ اس کتاب کے تقریباً ایک درجن اڈیشن زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں جن میں اضافات کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

ایک اور نادر تصنیف ''عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ'' کے موضوع پر تھی جس میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے آخری آٹھ سالوں میں لڑی گئیں اہم جنگوں کے مقامات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس مقصد کے لیے مصنف نے ۱۹۳۰ء کے عشرے میں ذاتی طور پر مدینہ، مکہ اور طائف کا سفر کیا۔ تاریخ میں محفوظ دستیاب مواد کی روشنی میں انھوں نے ذاتی طور پر مقامات کی پیائش کی اور میدانِ جنگ کے نقشے تیار کیے۔ میدانِ جنگ کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان جنگوں کے سیاسی اور سفارتی پس منظر کا بھی سراغ لگایا اور ان کے مقاصد و نتائج کا تجزیہ بھی کیا۔ مصنف نے خود اس کتاب کا انگریزی اور فرانسیسی میں نئے اضافوں کے ساتھ ترجمہ کیا۔ (۲)

سیرت کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی سب سے مفصل اور جامع کتاب ان کی فرانسیسی تالیف ''پیغمبرِ اسلام: حیات اور کارنامے'' ہے۔ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے جو مصنف کے جملہ نتائجِ تحقیق کی عمدہ اور جامع تلخیص پیش کرتی ہے۔ اس کتاب کے متعدد اڈیشن شائع ہوئے۔ آخری اشاعت پانچویں تھی جو ۱۹۸۹ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ کتاب کی پہلی جلد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی زندگی، مقاصدِ بعثت اور سیاسی و مذہبی معاملات پر مشتمل ہے۔ انتہائی شرحِ صدر کے ساتھ یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب ان کی سیرت سے متعلق معلومات اور تحقیقی نتائج کی بہترین مظہر ہے۔ پہلی جلد اسلوب اور مواد کے اعتبار سے بنیادی طور پر تاریخی نوعیت کی ہے، جب کہ دوسری جلد میں پیغمبرِ اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور پیغام سے متعلق دقیق مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ مزید برآں عہدِ نبوت کے معاشی اور سماجی معاملات کو بھی شرح و بسط کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے۔ ان دونوں جلدوں میں چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کے دوران عرب کے سیاسی اور سفارتی نظام کو بھی خصوصیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں مختلف ریاستوں اور قبائلی گروہوں کے درمیان تعلقات بھی اس کتاب کا اہم حصہ ہیں۔ تبلیغِ رسالت کی کامیابی میں مختلف قبائل کے کردار پر بحث اس کتاب کا وہ حصہ ہے جسے مصنف کی نہایت اہم خدمت قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ حصہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقدامات کے پس منظر اور اس کے اسباب کو سمجھنے میں بہت مددگار ہے۔ مصنف نے اسلام کے پیغام کے ارتقا میں قبائلی سرداروں اور ان کی جنگوں کے کردار کو ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اور وہ یہ

تحقیق کر لینے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ قبائل کے ساتھ معاہدے کیے تو کیوں کیے اور بعض کو نظر انداز فرمایا تو کیوں فرمایا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے ہم عصر فرماں رواؤں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت، حلیف اور حریف قبائلی سرداروں کے ساتھ معاملات کی حکمت کا اہم تاریخی دستاویزات کی روشنی میں تجزیہ کرنا اس کتاب کا انتہائی معلومات افزا اور سب سے اہم حصہ ہے۔ (۳)

نادر اسلوبِ تحقیق :

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے سیرت نگاری میں دیگر سیرت نگاروں سے الگ ہٹ کر تحقیق کی نئی راہ اپنائی ہے۔ عام سیرت نگار کتبِ حدیث، کتبِ سیرت و مغازی کی روایات کی جانچ پڑتال، ان کی تطبیق اور ان کی صحت و ضعف پر دادِ تحقیق دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان مصادر کے ساتھ ان مآخذ سے بھی استفادہ کیا ہے جو بظاہر غیر متعلق معلوم ہوتے ہیں جیسے قدیم جاہلی ادب، کتبِ انساب و سوانح اور سفر نامے وغیرہ۔ ان کتابوں کی معلومات سے آپ واقعاتِ سیرت کی تعبیر اور اس کے اسباب و علل کا جائزہ لینے میں مدد لیتے ہیں۔ تحقیق کا یہ اسلوب مغرب کا معروف اسلوب ہے۔ مغربی مفکرین کے ہاں تحقیقی مقالات کی حیثیت مصادرِ تحقیق کی رہی ہے۔ مقالات کے موضوعات اور ان کی تعداد ہمیشہ محققین کے مقام و مرتبے کا پتہ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اسی اسلوب کو اپنایا۔ اور مختلف اسلامی موضوعات پر قیمتی مقالات تحریر فرمائے جو اردو، انگریزی، فرانسیسی اور جرمنی زبانوں میں چھپے اور ترکی و فارسی میں تراجم بھی ہوئے۔ آپ کے اسلوبِ تحقیق میں ایک خاص بات مصادر کا احاطہ ہے۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ موضوع سے متعلق اصلی و ثانوی تمام مآخذ کو دیکھا جائے اور ان سے استفادہ کیا جائے۔ وہ قدیم و جدید کا موازنہ کرتے ہوئے اپنی مجتہدانہ رائے اختیار کرتے ہیں۔ ان کے اسلوبِ تحقیق میں مصادر کا موازنہ، استنباط و استخراج اور موجودہ معلومات کے ناقدانہ جائزے کے علاوہ ان کا اندازِ بیان بھی ہے۔ وہ اس خوبصورت انداز میں گفتگو کرتے ہیں کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تحقیقی تصانیف کا اسلوب عموماً پیچیدہ ہوتا ہے۔ ''خطباتِ بھاولپور'' میں تاریخِ حدیث کے موضوع پر لکچر میں سامعین کو حدیث کی اہمیت سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''حقیقت میں حدیث اور قرآن ایک ہی چیز ہیں۔ دونوں کا درجہ بالکل مساوی ہے۔ ایک مثال سے میرا مفہوم آپ پر زیادہ واضح ہوگا۔ فرض کیجیے کہ آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہوں اور ہم میں سے کوئی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کرنے کا اعلان کرے اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر یہ جاہل شخص اگر یہ کہے کہ یہ تو قرآن ہے خدا کا کلام، میں اسے مانتا ہوں مگر یہ آپ کا کلام ہے اور حدیث ہے، یہ میرے لیے واجب التعمیل نہیں ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فوراً ہی اس شخص کو امت سے خارج قرار دے دیا جائیگا، اور غالباً اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں پر موجود ہوں تو اپنی تلوار کھینچ کر کہیں گے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اجازت دیجیے کہ میں اس کافر و مرتد کا سر قلم

کردوں۔غرض رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی موجودگی میں یہ کہنا کہ یہ آپ کی نجی بات ہے اور مجھ پر واجب العمل نہیں ہے، گویا ایک ایسا جملہ ہے جو اسلام سے منحرف ہونے کے مترادف سمجھا جائے گا۔اس لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم جو بھی ہمیں حکم دیں اس کی حیثیت بالکل وہی ہے جو اللہ کے حکم کی ہے۔فرق دونوں میں جو کچھ ہے، وہ اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ قرآنِ مجید کی تدوین اور قرآنِ مجید کا تحفظ ایک طرح سے عمل میں آیا ہے، اور حدیث کی تدوین اور حدیث کا تحفظ دوسری طرح سے۔اس لیے تحقیق اور ثبوت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے"۔(۴)

ڈاکٹر حمید اللہ کے اسلوبِ تحقیق کا ایک اہم پہلو پیراگرافوں کا نمبر شماری ہے۔وہ اپنی تحریر کو پیراگرافوں میں تقسیم کرتے ہیں اور پھر انھیں مسلسل نمبر دیتے جاتے ہیں۔آپ کی تصنیف "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" ۴۲۱ پیراگراف پر مشتمل ہے۔جب کہ "خطباتِ بھاولپور" ۳۸۵ پیراگراف کا احاطہ کرتا ہے۔آپ کے بقول اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مختلف طباعتوں کے باعث صفحات کے نمبر بدل جاتے ہیں جس سے حوالوں میں الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔اگر پیراگرافوں کے نمبر ہوں تو ان کا حوالہ قائم رہتا ہے۔اسی اسلوبِ تحقیق کے مطابق آپ سے پہلے علامہ ناصر الدین البانی نے احادیث کی تخریج کی ہے اور ان کی تحقیق و تدقیق میں بھی یہی اسلوب کار فرما ہے۔اس طرح اب احادیث کا نمبر متعین ہو جانے کے بعد اس کی تلاش میں آسانی ہوگئی ہے۔ڈاکٹر حمید اللہ نے بھی اپنی سیرت نگاری میں اسی اسلوب کو اختیار کیا اور محققین کے لیے آسانیاں فراہم کردیں۔آپ نے اپنی کتابوں میں اشاریہ کا بھی اہتمام کیا ہے تا کہ استفادہ میں آسانی ہو۔

ادبی اسلوب نگارش :

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے خطبات و مضامین عربی زبان و ادب میں بھی ہیں اور انگریزی اور فرانسیسی زبان میں بھی۔لیکن آپ کے جو مضامین اور کتابیں اردو زبان میں ہیں، وہ اردو ادب کا بہترین شاہکار ہیں۔آپ نے اپنے مافی الضمیر کی ادائی کے لیے آسان، عوامی اور فصیح زبان کا استعمال کیا ہے۔آپ کی تحریریں شستہ اور عوامی ہیں، پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ باتیں دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جارہی ہیں۔آپ نے بھاول پور پاکستان میں بارہ خطبات مسلسل بارہ دنوں میں دیئے جس کو اسلامک بک فاؤنڈیشن دہلی نے کتابی شکل میں شائع کردیا اور اس کا نام "خطباتِ بھاولپور" رکھا۔ان خطبات کی اثر اندازی اور اثر پذیری کے سلسلے میں ڈاکٹر عذرا نسیم فاروقی نے لکھا ہے کہ:

"ڈاکٹر صاحب عاجزی اور سادگی کا پیکر تھے۔گفتگو کا انداز نہایت سادہ مگر شیریں اور شگفتہ تھا۔آپ کی ہر ہر ادا اور انداز سے تواضع کا اظہار ہوتا اور ہر بول سے انکساری ٹپکتی تھی۔آپ کی موجودگی میں تشنگانِ علم پر بجائے علمیت کی ہیبت سوار ہونے کے ایک طرح کی شفقتِ پدری کا احساس ہوتا تھا۔اسٹیج پر تشریف لاتے ہی اپنے مخصوص دھیمے اور پُر وقار لہجے میں انتہائی شائستگی کے ساتھ "السلام علیکم" کہتے اور خطبے کا آغاز فرمادیتے تھے۔تقریباً پچہتر (۷۵) منٹ تک ایمان و ایقان

سے سرشار یہ مردِ قلندر اور اس دور کا عظیم داعی اسلام، مفکر، معلم اور محقق انتہائی عالمانہ انداز میں ایک حیرت انگیز ربط، محکم ترتیب اور منطقی تسلسل کے ساتھ گفتگو کرتا رہتا۔ پھر حیرت اور استعجاب کی بات یہ ہے کہ ایسی عالمانہ اور فاضلانہ اور اس قدر محققانہ گفتگو کے دوران ڈاکٹر صاحب کے سامنے کوئی تفصیلی تحریر تو کجا کاغذ کا کوئی معمولی پرزہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اپنی خداداد یادداشت اور مضامینِ گفتگو پر غیر معمولی گرفت کی مدد سے بولتے چلے جاتے۔ مجال ہے کہ ایک لفظ یا جملہ کبھی دہرانے کی ضرورت پیش آئی ہو یا کوئی عبارت غیر ضروری طور پر منہ سے نکل جائے حتی کہ ضروری سنہ تاریخیں اور اعداد و شمار بھی ڈاکٹر صاحب کو زبانی یاد رہتے۔ لگتا تھا کہ علوم و معارف کا ایک دریا ہے جو بہتا چلا جارہا ہے۔ آپ اپنے ہر خطبے میں بیش بہا معلومات و مطالب اور حکمتوں کا ایک خزانہ لٹا دیا کرتے۔ یوں لگتا تھا کہ علمی حقائق اور فکری معارف اور نکات کی ایک موسلا دھار بارش ہے جو سامعین کے قلوب و اذہان کو سیراب کررہی ہے۔" (۵)

خطباتِ بھاول پور ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تحریری کتاب نہیں بلکہ برجستہ خطبات کا مجموعہ ہے۔ اس کے باوجود اس کے الفاظ اور جملوں میں اس قدر ربط اور ہم آہنگی ہے اور پورا مضمون ایک سلسلے میں اس طرح منسلک ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کو آپ نے ترتیب وار لکھ کر پڑھا ہوگا۔ عہدِ نبوی میں تبلیغِ اسلام اور غیر مسلموں سے برتاؤ کے موضوع کے تحت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں چچا ابوطالب اور ابولہب کا تذکرہ کچھ اس طرح کرتے ہیں:

"اس وقت بے محل نہ ہوگا اگر میں یہ بیان کردوں کہ ابولہب کو اپنے بھتیجے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نفرت کیوں پیدا ہوگئی تھی۔ بلاذری نے انساب الاشراف میں اس کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دن گھر میں دونوں بھائی یعنی ابولہب اور ابوطالب کسی بات پر لڑ پڑے۔ اولاً ابولہب نے اپنے بھائی کو زمین پر پٹخ دیا اور سینے پر طمانچے لگائے۔ اس کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جوان دنوں دادا کی وفات کے بعد ابوطالب کی کفالت میں تھے، ڈرتے ہوئے آتے ہیں اور ابولہب کو ابوطالب کے سینے سے ڈھکیل کر ہٹاتے ہیں۔ اس طرح ابوطالب کو اٹھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اب وہ ابولہب کو زمین پر پٹخ دیتے ہیں اور اس کے سینے پر چڑھ کر اپنا بدلہ لیتے ہیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چپ چاپ دیکھتے رہتے ہیں۔ ابولہب جل کر کہنے لگا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ابوطالب بھی تیرا چچا ہے اور میں بھی تیرا چچا ہوں۔ پہلے تو نے ابوطالب کی مدد کی لیکن اب میری مدد کے لیے کیوں نہیں آیا؟ خدا کی قسم میرا دل تجھ سے کبھی محبت نہیں کرے گا۔ بلاذری کی انساب الاشراف میں چھوٹا سا واقعہ بیان ہوا ہے۔ یہ نفسیاتی اصول ہے کہ جو لوگ جتنے زیادہ حساس ہوتے ہیں، اتنا ہی وہ چھوٹی سی چیز کا زیادہ اثر لیتے ہیں اور ان کے دلوں پر اس کا دیرپا اثر رہتا ہے، بلکہ روز افزوں ہوتا جاتا ہے۔ ممکن ہے یہی وجہ ہو جس کی بنا پر ابولہب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت پیدا ہوگئی ہو اور کبھی اپنے بھتیجے کے دین پر ایمان لانے پر آمادہ

نہ ہوا۔ چنانچہ اسے اسلام کے انتہائی شدید دشمنوں میں سے ایک قرار دے دیا گیا''۔(۶)

سیرت طیبہ کے مطالعے کی اہمیت :

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی سیرت نگاری کی ایک خوبی یہ ہے کہ آپ نے اپنے قارئین کے ذہنوں کو پہلے سے صاف و شفاف بنا دیا ہے کہ آپ سیرتِ طیبہ کے جس کتاب یا مضمون کا مطالعہ کرنے جا رہے ہیں، وہ کیوں کر رہے ہیں۔ اس کی اہمیت کیا ہے۔ چنانچہ ''رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی'' نامی کتاب میں آپ نے قارئین کے سامنے ایک سوال اٹھایا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ اب بھی کیوں ضروری ہے جب کہ آپ کی وفات کو بھی چودہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ علوم و معارف نے انتہائی ترقی کر لی ہے۔ اور متمدن دنیا نے قرآن و حدیث اور سیرتِ طیبہ کو فرسودہ اور پرانی تہذیب و تمدن کہہ کر اپنا پلہ اس سے جھاڑ لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سوال کا معقول جواب دیا ہے۔ غیر مسلمین سے خطاب کر کے کہا ہے کہ جب ہم سے کوئی شخص یہ بیان کرے کہ میں تمھارے فائدے کی بات کرنا چاہتا ہوں تو کون عقلِ سلیم رکھنے والا ایسا ہے جو اس بات کو سننے سے انکار کر دے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ جب یہ فرمایا تھا کہ میں تمام عالموں کے لیے رحمت بن کر آیا ہوں اور میرے لائے دین کے بغیر دنیا اور آخرت کی بھلائی حقیقت میں نصیب نہیں ہو سکتی تو اوچھی طبیعت رکھنے والوں نے ٹھٹھول شروع کیا اور مخالفت پر اتر آئے، اور سنجیدہ لوگوں نے اس کے برخلاف دینِ اسلام کے بارے میں سوال کیے۔ پھر جواب اور توضیح پر ٹھنڈے دل سے غور کیا اور جس کی رائے میں بات معقول تھی، اس نے اس دین کو قبول کر لیا''۔(۷)

مسلمانوں کے لیے سیرت کا مطالعہ کیوں ضروری ہے؟ ڈاکٹر صاحب اپنی کتاب میں رقم طراز ہیں:

''یوں تو کسی مسلمان کی زندگی اسی وقت اسلامی کہلاتی ہے جب وہ قرآنِ مجید کے احکام کے مطابق ہو، لیکن قرآن نے خود متعدد جگہوں پر سنت نبوی کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا ہے اور اسے واجب العمل قرار دیا ہے۔ اس سے سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت بھی جزوِ قرآن نہیں تو کم از کم ضمیمۂ قرآن اور تتمۂ قرآن کی ہو جاتی ہے۔ پیشوائے اعظم، سردارِ دو عالم کا قول، آپ کا فعل اور جن چیزوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ میں برقرار رکھا، ان سب پر عمل کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ خود احکامِ قرآنی پر ہے''۔(۸)

سیرت طیبہ اور خواتین :

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی سیرتِ طیبہ کی تحریروں میں جہاں مردوں کے کارناموں کو گنایا ہے، اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، وہیں آپ نے امہات المؤمنین اور خواتین کے کارناموں کا خصوصی تذکرہ کر کے خواتین کو بھی آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ بھی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ انھیں جیسی خواتین نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں اپنا کردار کس طرح ادا کیا ہے۔ چنانچہ ''محمد رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" نامی اپنی کتاب میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عائلی زندگی کے عنوان کے تحت امہات المؤمنین اور ان کے کارناموں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان امہات المؤمنین نے خواتین سے متعلق پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی تھی اور خواتین تک ان مسائل کو پہنچایا جو براہِ راست خواتین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے میں جھجک محسوس کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ امہات المؤمنین نے آپ کی نجی زندگی کو عوام کے سامنے پیش کرنے میں نمایاں رول ادا کیا۔ آپ کی عبادات گھر میں کس طرح کی ہوتی تھیں۔ روزہ کا اہتمام آپ کب کب کرتے تھے۔ اہلِ بیت اور بچوں کے ساتھ آپ کس طرح پیش آتے تھے۔ اپنے مہمانوں، ملازموں اور غلاموں سے آپ کا سلوک کیا تھا۔ اور آپ اپنے گھر میں کس طرح کا خوشگوار ماحول پسند کرتے تھے۔ آپ کو کیا چیزیں پسند تھیں اور کیا ناپسند تھیں۔ ازواجِ مطہرات نے اس کی پوری تفصیل ہمیں فراہم کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے امہات المؤمنین کا بھرپور تذکرہ کرکے خواتین کو دعوتِ فکر دی ہے کہ وہ بھی امہات المؤمنین کی طرح اپنے شوہروں کے دوش بدوش کھڑی ہوکر دین کی تبلیغ واشاعت اور بچوں کی تعلیم وتربیت میں بھرپور کردار ادا کرسکتی ہیں۔ سب سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ ملتا ہے جنھوں نے مشکل ترین حالات میں آپ کا ساتھ دیا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی دولت یتیموں، مسکینوں، بیواؤں کی خدمت گزاری میں صرف ہوئی۔ لونڈی اور غلاموں کے لیے بھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا اسوہ قابلِ ذکر رہا۔ آپ کے علاوہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اور دیگر امہات المؤمنین کا تذکرہ کرکے ان کے کارناموں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ نے امہات المؤمنین کے علاوہ صحابیات کا بھی مختلف زاویوں سے تذکرہ کیا ہے۔ ایک جگہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایک انصاری عورت تھیں جو بہت پہلے ایمان لائی تھیں۔ چنانچہ ان کے متعلق لکھا ہے کہ جنگِ بدر (۲ ہجری) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے روانہ ہوئے تو انھوں نے اپنی خدمات پیش کیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں۔ میں اسلام کے دشمنوں سے جنگ کرنا چاہتی ہوں۔ ان کے متعلق ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ایک مسجد کا امام مامور فرمایا تھا"۔ (۹)

عظمت صحابہ رضی اللہ عنہم:

قرآنِ کریم اور احادیثِ نبویہ کا مطالعہ ہم کو بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام ومرتبہ بہت بلند فرمایا ہے۔ ان کو اپنی رضامندی کی سند اسی دنیا میں عطا کردی ہے اور بعد میں آنے والے مسلمانوں سے مطالبہ کیا ہے کہ ان سے محبت کریں۔ ان سے تعلقِ خاطر کا اظہار کریں اور ان کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے ہمیشہ ہمیش کی جنت کا وعدہ

فرمایا ہے۔ متعدد مقامات پر ان کی تعریف وتوصیف کی ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کی تعریف وتوصیف فرمائی ہے اور ان سے محبت والفت اور ان کی عظمت کا احترام امتِ مسلمہ کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ وہ عام انسانوں کی طرح صرف انسان نہیں بلکہ انتہائی سخت آزمائشوں کے دور میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا حق ادا کیا تھا اور اپنی جانوں کی قربانی دے کر اسلام کے اس ننھے سے پودے کو تناور درخت بنایا تھا۔ اس لیے ان کا احترام ہمارے اوپر واجب ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کی ایک کمی ہے کہ آپ اپنے ان مضامین ومقالات میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اس عظمت واحترام کا خیال اس طرح نہیں رکھتے ہیں جو ایک مسلمان سے مطلوب ہے۔ مثال کے طور پر ہجرتِ مدینہ سے قبل مدینے کے مسلمانوں کی تعلیم وتربیت اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی کو مدینہ منورہ روانہ کیا تھا۔ آپ نے اپنے فرائضِ منصبی کو بخوبی ادا کیا۔ آپ کی کارکردگی کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر حمید اللہ رقم طراز ہیں:

"مصعب (رضی اللہ عنہ) کی کامیابیوں میں روز افزوں اضافہ ہورہا تھا۔ وہ اکثر وبیشتر رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی کامیابیوں سے تحریری طور پر مطلع کرتا رہتا تھا۔ غالباً وہ اپنے خطوط میں حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مزید ہدایات اور اپنے سوالوں کے جوابات بھی طلب کرتا رہتا تھا"۔ (۱۰)

اسی طرح صلحِ حدیبیہ کے بعد حضرت ابوبصیر رضی اللہ عنہ کا تذکرہ ڈاکٹر صاحب نے اس انداز سے کیا ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب واپس مدینہ جارہے تھے تو ایک اور مکی مسلمان ابوبصیر انھیں راستے میں ملا۔ وہ مکے سے بھاگ کر رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پناہ میں آیا تھا۔ ابوبصیر (رضی اللہ عنہ) کے خاندان کے دو افراد بھی اس کے فوراً بعد رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبصیر (رضی اللہ عنہ) کو ان کے سپرد کردیا"۔ (۱۱)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ۳۵ سال تک سیرتِ نبوی کی خدمت کی ہے۔ سیرتِ طیبہ کے مختلف موضوعات کا مطالعہ کیا اور متعدد مقالات اور کتابیں تحریر کرکے مسلم دنیا کے سامنے مشہور سیرت نگار کی حیثیت سے اپنا مقام مستحکم کرلیا۔ لیکن مجھے یہ بات کہنے میں کوئی جھجھک نہیں محسوس ہورہی ہے کہ ڈاکٹر صاحب اصلاً سیرت نگار نہیں تھے بلکہ آپ کا اصل میدانِ کار قرآن وحدیث اور فقہ تھا۔ اور اسلام کے بین الاقوامی قانون پر آپ کا اختصاص تھا۔ آپ نے اس میدان میں عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ہیں۔ یہی کارنامے آپ کی نیک نامی کا ذریعہ بھی ہیں اور آپ کی شہرت بھی انھیں کارناموں سے ہے۔ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کے کام کا جائزہ واضح کرتا ہے کہ آپ نے اس موضوع پر کام کا آغاز کتاب لکھنے کی منصوبہ بندی سے نہیں کیا بلکہ ضرورتاً سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا عہدِ نبوی کے کسی پہلو نے آپ کو متوجہ کیا تو آپ نے اس پر تحقیق شروع کردی اور وہ تحقیق بنیادی طور پر ایک مقالے کی

صورت میں ڈھل گئی۔ پھر کوئی اور پہلو جاذبِ توجہ ہوا تو اس پر لکھا اور وہ ایک مضمون کی صورت میں چھپ گیا۔ جب بہت سے مضامین شائع ہو گیے اور ان میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت یا آپ کا عہد مرکزی خیال کے طور پر موجود تھا تو انھیں یکجا کر کے کتابی صورت میں چھاپ دیا۔ سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈاکٹر صاحب کی کتابیں دراصل مقالات کا ہی مجموعہ ہیں جو وقتاً فوقتاً چھپتے رہے حتی کہ فرانسیسی زبان میں آپ کی مستقل اور مربوط کتاب ''محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' ان کی اس وقت تک کی چھپی ہوئی معلومات مجموعہ ہے۔ دو ایک چھوٹی چھوٹی کتابوں کو چھوڑ کر سب کتابیں دراصل مجموعے ہیں۔ اس لیے آپ کو سیرت نگار نہ کہہ کر قرآن وحدیث اور فقہ کا عالم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

تعلیقات وحواشی

(۱) سہ ماہی فکر ونظر، محمود احمد غازی بعنوان علومِ اسلامیہ میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی خدمات (عمومی جائزہ، حوالہ بالا، ص ۸۴-۸۵)

(۲) نفس مصدر ص ۸۵-۸۷ (۳) نفس مصدر ص ۸۸

(۴) ڈاکٹر محمد حمید اللہ، خطباتِ بھاول پور، اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی (۲۰۰۸ء) ص ۵۷-۵۸

(۵) سہ ماہی فکر ونظر، عذرا نسیم فاروقی بعنوان خطباتِ بھاول پور: ایک تاریخی دورہ کی جھلکیاں، حوالہ بالا ص ۷۰، آپ نے ان خطبات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''ہماری حالیہ تہذیبی اور علمی تاریخ کی ایک اہم روایت ''خطبات'' کی بھی رہی ہے۔ مختلف موضوعات پر علومِ اسلامیہ کے ممتاز علما اور ماہرین کے سلسلہ ہائے خطبات کا اہتمام اور ان کی اشاعت وترویج کا انتظام ہماری علمی زندگی کا ایک اہم اور مفید حصہ رہا ہے۔ ماضی قریب میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، علامہ محمد اقبال، محمد مارماڈیوک پکتھالؒ اور محمد الخضری بکؒ کے خطبات کو خاص طور پر اہلِ علم میں بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی بلکہ یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ بعض حضرات کے دیئے ہوئے خطبات کو ان کی باقاعدہ تصنیف کردہ کتب سے کہیں زیادہ مقبولیت ملی''۔ (ص ۶۶)

(۶) ڈاکٹر محمد حمید اللہ، خطباتِ بھاول پور، حوالہ بالا، ص ۴۰۶

(۷) ڈاکٹر محمد حمید اللہ، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی، دارالاشاعت کراچی، ۱۹۸۰ء، ص ۱۲

(۸) نفس مصدر ص ۱۲ (۹) ڈاکٹر محمد حمید اللہ، خطباتِ بھاول پور، حوالہ بالا، ص ۴۹ (۱۰) نفس مصدر ص ۸۷

(۱۱) نفس مصدر، ص ۱۱۲۔ اسی طرح کی متعدد مثالیں آپ کی کتاب میں دستیاب ہیں۔ مزید جانکاری کے لیے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔

حضرت صوفی غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ

مولانا محمد جمال الرحمٰن مفتاحی

موجودہ دور میں قلوب و اذہان کے بگاڑ کے بنیادی اسباب میں زبان وقلم کے استعمال میں بے احتیاطی اور نامناسب انداز کا بڑا دخل ہے۔ اس لیے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ لوگ ادبِ اسلامی سے آگاہ ہوں اور آدابِ زندگی کو سیکھنے اور سکھانے کے لیے زبان وقلم کے استعمال میں مزاجِ اسلامی ملحوظ رکھیں۔

سلطان العارفین حضرت شاہ صوفی غلام محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش ۹؍رجب ۱۳۳۷ھ روز پنجشنبہ رات ۹ بجے کلواکرتی کے موضع ''کوٹرہ'' میں ہوئی۔ ابتدائی ایام یہیں گزرے اور اس کے بعد آپ کے والدین موضع ''مغل گدہ'' تعلقہ شادنگر منتقل ہوگیے۔ انھوں نے قرآنِ شریف اپنے نانا حضرت مولوی عبد الرحمٰن صاحبؒ خطیب وقاضی مغل گدہ سے گھر ہی پہ پڑھا۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ وسطانیہ مغل گدہ میں ہوئی۔ ۱۹۳۷ء میں مڈل بورڈ کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۸ء میں منشی پنجاب، امتحان کے لیے لاہور تشریف لے گیے۔ امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ڈیڑھ دو سال تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا۔ آخرکار جون ۱۹۴۰ء کو سررشتۂ تعلیم سے وابستہ ہوگیے۔ مختلف مقامات پر بحسن وخوبی اپنی تدریسی خدمات انجام دے کر ۱۹۷۳ء کو سبک دوش ہوئے۔

ان کے جن اساتذۂ کرام نے ان کی تعلیم وتربیت میں گراں قدر حصہ لیا، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ ۱- مولوی امیر احمد رضوی، ۲- مولوی احمد شریف، ۳- مولوی حافظ عزیز الرحمٰن، ۴- مولانا محمد جعفر، ۵- اور مولانا سید ریاض الدین علی حسامی (رحمہم اللہ تعالیٰ)۔ بالخصوص مولانا سید ریاض الدین علی حسامی کی صحبت نے ان پر خصوصی اثر دکھایا۔ چنانچہ وہ اپنے وقت کے مشہور صاحبِ نسبت بزرگ حضرت مولانا محمد حسین قادری قبلہ رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع ہوئے اور شبِ قدر رمضان ۱۳۵۵ھ کو آپ کے ہاتھ پر بیعت فرمائی۔ حضرت ناظم صاحبؒ کی وفات کے بعد اُن کے خلیفۂ اجل حضرت سید حسین قادری قبلہ نے حضرت صوفی صاحبؒ کو ۱۳۶۹ھ میں خلافت سے سرفراز فرمایا۔

حضرت صوفیؒ اگرچہ پیشے کے اعتبار سے سرکاری مدرس رہے، لیکن زندگی کا بیشتر حصہ دین کی دعوت اور خلقِ خدا کی خدمت میں گذارا۔ گاؤں گاؤں جاکر وعظ وبیان کرتے۔ شرک وبدعات، رسوم وخرافات اور جہالت وگمراہی سے لوگوں کو آگاہ کرتے۔ جنوبی ہند کے جن گھروں میں لوگ ''نرسو'' کی پوجا کرتے، وہاں جاکر اُس کی بیخ کنی اپنے ہاتھوں سے کی اور لوگوں کے دلوں میں ایمان و یقین اور توحید کی اہمیت وعظمت پیدا کی۔ مغل گدہ کی عیدگاہ میں انھوں نے ۳۰ سال اعزازی طور پر خطابت کے فرائض انجام دیئے۔ ان کے بیانات میں عجیب دل کشی، معرفت شناسی اور زبان و ادب کی بھرپور رعنائی ہوتی تھی، جو سیکڑوں دلوں کے بننے، گم گشتہ راہوں کے سنبھلنے اور پلٹنے کا موقع فراہم کرتی۔ الوہیتِ الٰہیہ، شانِ رسالتِ محمدیہ (علی صاحبہا الصلاۃ و التحیۃ) اور اعتباراتِ عبدیت، عبادت واستعانت ان کے خاص موضوعات تھے۔ ان کی خصوصی مجالس، عرفانِ حق کے لیے ہوتیں۔ اللہ ہی جانتا ہے کتنوں نے ان کے ہاتھ پر توبہ کی اور کتنے ہی اسلام قبول کرکے صاحبِ حال وقال بنے۔ علمِ لدنی سے آراستہ ان کی بافیض ہستی سے فارغ التحصیل علما بھی استفادہ کرتے، حقائق کی یافت کے

طلب گاران سے نہایت آسان تشفی بخش جواب پاتے۔

حضرت صوفی کے بارے میں حضرت مولانا حمید الدین عاقل حسامی رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ و تعارف از بس کہ کافی ہوگا۔ فرماتے ہیں: ''حیدرآباد کے اہلِ دل بزرگوں میں واعظ باعمل، صافیِ صافی، حامیِ سنت، ماحیِ بدعت، مولانا غلام محمد صوفی اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی کی ہر ساعت عبادت و ریاضت میں بسر ہوتی ہے۔ موصوف ایک صاحب سلسلہ بزرگ ہیں جن کے ہزاروں مریدین و معتقدین مختلف مقامات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ مولانا موصوف کے دستِ حق پرست پر لاکھوں گمراہوں اور کفر و ضلالت میں بھٹکنے والوں نے بیعت کر کے اپنی عاقبت روشن کی''۔

(تعارف از مولانا عاقل، کلامِ غلام صفحہ ۷)

وعظ گوئی کے ساتھ ساتھ حضرت صوفی صاحبؒ نے قلمی خدمات بھی انجام دیں۔ چنانچہ متعدد کتابیں تحریر فرمائیں۔ اپنی نوعیت کی منفرد خود نوشت سوانح ''آئینۂ غلام'' قلم بند فرمائی۔ سفرِ حج کا روزنامچہ ''تبرکاتِ حرمین'' کے نام سے موجود ہے۔ سورہ فاتحہ کی علمی و عرفانی تفسیر مرتب فرمائی۔ اپنے شیخ سے کیے ہوئے خط و کتابت کے مراسلے ''مکاتیبِ عرفانی'' کے نام سے شائع ہوئے۔ شیخ کے ملفوظات کو ''تجلیاتِ بحرِ معرفت'' کے نام سے جمع فرمایا۔ آپ کا منظوم کلام ''کلامِ غلامؔ'' کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت صوفی صاحبؒ گو کہ ایک مدرس، داعی و واعظ اور مرشدِ کامل تھے، تاہم ایک بلند پایہ پاکیزہ جذبات سخن ور اور صاحبِ طرز فطری شاعر تھے۔ اگرچہ انھوں نے اس کو مستقل تو نہیں اپنایا لیکن ایسا لگتا ہے کہ قلبی واردات الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر شاعری کے لباس میں آراستہ ہو گیے ہیں۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں: ''مدرسے میں کتابی نظمیں دیکھیں، جماعت نشی میں مولانا شبلی علیہ الرحمۃ کی شعر العجم کے ذریعے شاعری پر ضروری معلومات حاصل ہوئیں اور کچھ لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ کسی استاذِ محترم کی سرپرستی حاصل نہ ہو سکی، صرف دو تین غزلیں مولانا محمد اسماعیل شریف ازلؔ کی خدمت میں اصلاح کے لیے پیش کی گئیں، حسبِ موقع و ضرورت جیسی واردات ہوتی رہیں، قلم بند کر لی گئیں اور یہ سارا مجموعہ واردات ہی واردات ہے''۔

حضرت صوفی صاحبؒ کا یہ منظوم کلام جس میں علم و عرفان کا نور بھی ہے اور شوق و وارفتگی کا وفور بھی، عظمت و عقیدت کے پھول بھی ہیں اور نزہت و ندرت کی خوش بو بھی، رعایتِ شعر و سخن کے ساتھ حدود و آداب کا توازن بھی ہے اور خیال کی بلندی و جذبات کی پاکیزگی بھی۔ حمد و نعت کا فرق بھی ہے اور عبد و رب کا تعلق بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ایک ایک شعر علوم و معارف کا بحرِ بے کراں ہے، جن کے مطالب کی تہہ تک پہنچنا بغیر کسی مرشدِ کامل کی رہبری کے ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

نعتِ نبی کے اشعار دیکھیے:

میری جاں آپ پہ قربان رسولِ عربی
دل ہو صدقے بصد ارمان رسولِ عربی
یوں پیمبر تو بہت اور ہوئے ہیں لیکن
آپ سا کون ہے سلطان رسولِ عربی
کیا ہو توصیف بھلا آپ کی اے حسنِ ازل
شیفتہ آپ کا سبحان رسولِ عربی
نغمۂ حالِ دلِ زار سناتا جی بھر
کاش ہوتا میں حدی خوان رسولِ عربی
حق تعالیٰ سے دعا ہے یہ مری شام و سحر
ہم پہ ہو آپ کا فیضان رسولِ عربی

ایک دوسری نعت میں کیا خوب فرماتے ہیں:

شکرِ خدا کہ دل میں ہے الفت رسول کی
آنکھوں میں ہے وہ نور سی صورت رسول کی

دعوت و تبلیغ کے ذیل میں اپنی فکر و تڑپ نہایت پُر سوز

انداز میں ظاہر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اٹھو دنیا کو پھر اک بار پُرانوار کرڈالو
اٹھو اخلاق کے پرچم کو پھر دنیا پہ لہرا دو
اٹھو انسانیت کے فاش کچھ اسرار کر ڈالو
اٹھو کردار سے اشرار کو ابرار کر ڈالو
اُٹھو انسانیت کی پھر وہ دعوت دو محبت سے
تعصب کے بھنور میں ہے یہ کشتی پار کر ڈالو

انسانیت نوازی و وطن دوستی کون نہیں چاہتا؟ حضرت صوفیؒ اس کو اسلام پسندی کے ساتھ دکھاتے ہیں:

اسلام میں نہاں ہے جہاں کی سلامتی
اسلام چھوڑتے ہی جہاں بے قیام ہے
قوم و وطن و فرقہ پرستی ہے شرک خاص
جو حق پرست ہے وہ خدا کا غلام ہے

اسلامی تعلیمات میں اخلاص کی اہمیت کون نہیں جانتا؟ تصحیحِ نیت کے ذیل میں حضرت غلام فرماتے ہیں:

جو کام بھی کرو وہ برائے خدا کرو
نیت ہر ایک کام میں قرب و رضا کرو
للّٰہیت خلوص و محبت سے کام ہو
نام و نمود سمعہ ریا سے بچا کرو
اللہ کے واسطے ہی کسی کے بنو غلام
مخدوم بھی خدا کے لیے ہی بنا کرو

ایک دوسری جگہ غزل سرا ہیں:

خدا کو بصیرت سے پاتا چلا جا — محمد کو آنکھوں میں لاتا چلا جا
شریعت کی باتیں بتاتا چلا جا — طریقت کی گھاتیں سکھاتا چلا جا
بہا انس و الفت کے دریا بہادے — گلے دشمنوں کو لگاتا چلا جا
اگر تجھ کو دیوانہ کہہ دے یہ دنیا — پلٹ، دیکھ، پھر مسکراتا چلا جا
کسی کو نظر میں جماتا چلا جا — کسی کی نظر میں سماتا چلا جا

صوفیا کی تعلیمات، انسانیت اور انسانی اقدار کے فروغ کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ اس کے بغیر مذہب کا تصور بودا ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں:

حسن و جمالِ یار پہ قرباں ہوا تو کیا
مجبور موت پر کوئی نازاں ہوا تو کیا
عاشق غمِ فراق میں گریاں ہوا تو کیا
ان کی بلا سے کوئی پریشاں ہوا تو کیا
انسانیت کو چھوڑ کے انساں ہوا تو کیا
ہندو ہوا تو کیا وہ مسلماں ہوا تو کیا

گناہ کے بعد توبہ تو سبھی کہتے ہیں، لیکن حضرتِ غلام کی بلند خیالی دیکھیے:

شرمندگی خیالِ گنہ پر کمال ہے
کرکے گناہ کوئی پشیماں ہوا تو کیا
سورج کو وقتِ شام کوئی پوچھتا نہیں
ماضی اگر کسی کا درخشاں ہوا تو کیا

سلوک و طریقت میں خود شناسی کے بعد خدا شناسی کی منزل آتی ہے۔ سادگی اور پرکاری دیکھیے:

خود کو کھونا وصال ہے میرا — حق کو پانا کمال ہے میرا
میری جاں میرا دل یہ سب ان کا — میرا میرا خیال ہے میرا

الغرض حضرتِ غلام کا پورا کلام البیلے انداز کا اچھوتا شاہکار اور علوم و رموز کا بحرِ ذخار ہے، جس کا ایک ایک شعر کلیدِ معرفت اور اسرار کا گنجِ گراں مایہ ہے، جس کے بارے میں خود شاعرِ عارف کا تاثر یہ ہے:

عالمِ عشق آنسو بہانے لگا — عالمِ عقل بھی مسکرانے لگا
عالمِ شعر و فن گنگنانے لگا — ہاتھ میں جب کلامِ غلام آگیا

ضرورت ہے کہ حضرت صوفی غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی علمی، دینی، دعوتی اور ادبی خدمات پر مستقل کام کیا جائے۔

دکن میں اُردو نعت گوئی

ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی
صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج
ہبلی (کرناٹک)

تاریخی حیثیت سے اردو میں نعت گوئی کی روایت نئی نہیں، بہت پرانی ہے، اتنی ہی پرانی جتنی کہ خود اردو شاعری۔ قدیم دکنی شعرا سے لے کر آج تک اردو کا شاید ہی کوئی شاعر ہو جس نے نعتیہ اشعار نہ کہے ہوں، اس میں نہ مذہب و عقیدے کی قید ہے، نہ مسالک و مکاتب کی۔ اردو شاعری کے ہر دور اور ہر موڑ پر نعتیہ شاعری پورے انہماک اور ذوق و شوق سے ہوتی رہی ہے۔ یہ بات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقبولیت و محبوبیت اور عظمت و رفعت کے ساتھ ان کی شخصیت کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے! اور پھر اسے ہم قرآنِ حکیم کی آیت ﴿ و رفعنا لک ذکرک ﴾ کی عملی تفسیر و تعبیر کہہ سکتے ہیں۔

آٹھویں صدی ہجری سے بارہویں صدی ہجری تک یعنی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی 'معراج العاشقین' اور نظامی کی 'کدم راؤ پدم راؤ' سے لے کر فدوی اور مفتون تک دکن میں جتنی مثنویاں، قصیدے، مولود نامے اور معراج نامے لکھے گیے، سب کے یہاں نعتیہ شاعری کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں۔ جس کے تفصیلی تذکرے اور مثالوں کو پیش کرنے کی یہاں چنداں ضرورت نہیں۔ اس سلسلے میں کئی نعتیہ تحقیقات موجود ہیں۔

ولی دکنی (م ۱۷۲۰ء) کی زبان یقیناً دکنی شعرا کی زبان ہے۔ مگر کافی منجھی ہوئی۔ کلام میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ ولی ایک مذہبی اور صوفی مشرب انسان تھے۔ آپ کے عاشقانہ اشعار خوب ہیں اور یہاں بھی اخلاقی پہلو ملحوظ ہے۔ ولی کے ایک نعتیہ قصیدے کا آغاز یوں ہوتا ہے:

عشق میں لازم ہے اوّل ذات کوں فانی کرے
ہو فنا فی اللہ دائم یادِ یزدانی کرے
یا محمد دو جہاں کی عید ہے تجھ ذات سوں
خلق کوں لازم سب کوں تجھ پہ قربانی کرے
عارفاں جو لیں گے جان و دل سوں لاکھوں آفریں
جب ولی تیری مدح میں گوہر افشانی کرے

ایک غزلیہ نعت کے چند اشعار دیکھیے:

آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں
تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا

کیا کہے تعریف دل ہے بینظیر
حرف حرف اس مخزنِ اسرار کا
اے ولی کہو نا سریجن پر نثار
مدعا ہے چشمِ گوہر بار کا

نعتِ نبوی کی طرف ولی دکنی کا میلانِ طبع اپنے محدود ماحول کا فطری تقاضا تھا۔ اُن کے دیوان میں غزل، قصیدہ، مثنوی، مخمس اور مستزاد کی شکل میں نعتیں ملتی ہیں۔ ولی کی نعت اس لیے بھی کافی وقیع اور اہم ہیں کیوں کہ وہ معتدل اور افراط وتفریط کے اسقام سے پاک ہیں اور ان کے یہاں مضامینِ قرآن وحدیث سے بے حد نیازمندانہ طور پر نظم کیے گیے ہیں۔

سراج اورنگ آبادی (م ۱۷۶۴ء) کا زمانہ عبوری زمانہ تھا۔ اس میں قدیم رنگ کی شاعری ختم ہوئی اور نئے طرز کا آغاز ہوتا ہے۔ سراج کے یہاں رسمی نعتیں ملتی ہیں۔ وہ اپنے نعتیہ کلام میں انتہائی سادگی اور روانی کے ساتھ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصافِ حمیدہ اور سیرتِ طیبہ نظم کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی ایک مثنوی کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

کہا حق نے لولاک جس کی شان میں
شہنشاہ ہے ملکِ عرفان میں
سدا گمرہوں کا وہی رہنما
ہے خیر الوری احمدِ مجتبیٰ
عجب ذات مقبولِ کونین ہے
کہ کونین کا قرۃ العین ہے

بارہویں صدی ہجری شمائل ناموں اور معراج ناموں کے لیے بہت مشہور ہے۔ عبدالحمید ترین اور محمد عثمان نے شمائل نامہ لکھے ہیں، جن کی زبان بہت سلیس اور عام فہم ہے۔ معظم بیجاپوری، محمد ابن مجتبیٰ مہدی، سید بلاقی، پھمن نرائن اورنگ آبادی اور شاہ ابوالحسن قرلی کے پانچ معراج نامے قابلِ ذکر ہیں جو بیان کی ندرت کی وجہ سے زندہ جاوید رہیں گے۔ اس دور میں سیرتِ طیبہ کے باب میں دو نعتیہ ذخائر قابلِ ذکر ہیں۔ نوازش علی شیدا نے ۱۱۸۶ھ میں 'اعجازِ احمدی' اور ۱۱۷۳ھ میں 'روضۃ الاظہار' لکھی جس میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل حیاتِ طیبہ نظم کی گئی ہے۔ دوسرا قابلِ ذکر نعتیہ ذخیرہ محمد باقر آگاہ کی تخلیق 'ہشت بہشت' ہے جس میں سیرتِ طیبہ اور اخلاقِ حسنہ کو نعتوں میں محفوظ کیا گیا ہے۔

تیرہویں صدی ہجری میں دکنی شاعری کے افق پر کئی باکمال نعت گو شعرا طلوع ہوئے جن میں شیر محمد خاں ایمان، خواجہ فیاض الدین بندہ، خواجہ معین الدین شاہ موش، خواجہ عبد اللہ خاں خیر، محمد حیات خاں میسوری اور شیخ محمود علی ناظم حیدر آبادی نے نعت میں مستقل تصانیف چھوڑی ہیں اور اس فن میں خاصی شہرت واہمیت کے حامل ہیں۔

اسی طرح چودہویں صدی ہجری میں کئی نعت گو شعرا نمایاں ہوئے جن میں ایک عظیم الشان شخصیت حاجی اعظم علی

شائق کی ہے، جن کی نعتیہ عطاؤں کو قبولِ عام اور شہرتِ دوام کی سند ملی۔ آپ نے اردو نعت کو گیت اور ٹھمری کے سہارے ہندستانی رنگ دیا۔

اردو شاعری میں جب ہم دبستانِ دکن کی بات کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہمارا ذہن مہاراشٹرا، کرناٹک سے لے کر آندھرا اور تامل ناڈو تک پورے جنوبی ہند کے خطۂ ارض پر ہونے والی شاعری کی طرف جاتا ہے اور یہ بالکل فطری ہے۔ مگر میں سرِ دست ارضِ دکن سے مراد آزادیٔ ہند سے پہلے کے حیدرآباد سے لیتا ہوں، جس میں مہاراشٹرا کا اورنگ آباد اور اکولہ اور کرناٹک کا گلبرگہ اور بیدر شامل ہے۔ شعرائے دکن کے مختلف ادوار سے بطور نمونہ دو چار نعت گو شعرا کا بھی ذکر کروں تو اُن میں مہاراجہ سرکشن پرشاد حیدرآبادی کا نام نامی خصوصی اہمیت کا حامل ہے، جنھوں نے اس فن میں اپنا نمایاں مقام بنایا ہے۔ آپ کی پیدائش ۱۸۶۴ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ شعر و سخن سے انھیں گہرا شغف تھا۔ اردو و فارسی دونوں زبانوں میں اشعار کہتے تھے۔ بقول رام بابو سکسینہ ان کی چالیس شعری تصانیف ہیں۔ ''بیاضِ شاد'' غزلوں میں، اور ''خم کدۂ رحمت'' نعتوں پر مشتمل دو اردو دیوان ہیں۔ یوں تو ان کا سارا شعری سرمایہ ہی اسلامی اور اخلاقی و روحانی نظریے کے نور سے معمور ہے۔ کلام میں صوفیانہ اور عارفانہ رنگ ہر جگہ موجود ہے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگانِ دین سے انھیں بے شمار محبت و عقیدت رہی ہے۔ جس کا ثبوت ان کا مکمل نعتیہ دیوان ''خم کدۂ نعت'' ہے۔ خلوص و محبت کی لافانی خوش بو سے معطر آپ کا نعتیہ کلام سادہ اور عام فہم ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

بلوائیں مجھے شادؔ جو سلطانِ مدینہ
جاتے ہی میں ہو جاؤں گا قربانِ مدینہ
لے جاؤں میں ساتھ فقط عشقِ محمد
تحفہ ہے مرے پاس یہ شایانِ مدینہ
نشہ ہے وہ ان کو جو اترتا ہی نہیں ہے
توحید کی مے پیتے ہیں مستانِ مدینہ
کیوں میری شفاعت میں بھلا دیر لگے گی
کیا مجھ کو نہیں جانتے سلطانِ مدینہ
مومن جو نہیں ہوں تو میں کافر بھی نہیں ہوں
اس رمز سے آگاہ ہیں سلطانِ مدینہ

سید احمد حسین امجدؔ حیدرآبادی ۱۸۵۶ء میں ایک خدا ترس صوفی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے تقریباً ایک درجن شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ رباعیاتِ امجدؔ حصہ اول و دوم اردو ادب میں بہت زیادہ مقبول و مشہور ہوئے اور یہی آپ کی اصل شناخت ہیں۔ لیکن امجدؔ حیدرآبادی کا شعری سرمایہ حمدیہ، نعتیہ اور منقبتی کلام سے بھی آراستہ و پیراستہ ہے۔ آپ نعت گوئی کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایسا کوئی اسلوب اختیار نہیں کیا ہے، جس سے نعت اور حمد میں کوئی واضح فرق نہ رہ جائے۔ انھوں نے اس میں حدِ فاصل کا

خصوصی خیال رکھا ہے۔ بقول خود امجدؔ حیدر آبادی:

میری زباں پہ نعت ہے
تیری زباں پہ حمد ہے
سبحانہ تیری صدا
صلِّ علیٰ میرا بیاں

امجدؔ کے نعتیہ کلام میں فکر کی بلندی، خیال کی گہرائی اور جذبے کی تاثیر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انھوں نے حیاتِ طیبہ کے مختلف واقعات کو بڑی خوش اسلوبی سے شاعرانہ پیکر عطا کیا ہے۔ نعتیہ مجموعہ ''نذرِ امجدؔ'' میں ہجرتِ نبوی کے حالات و واقعات، اہلِ مکہ کی فریاد اور اہلِ مدینہ کے انبساط کا ذکر بڑے خلوص و عقیدت، سوز و گداز، جذب و تاثیر اور جوش و جذبے کے ساتھ کیا ہے۔ ایک نظم کے چند بند دیکھیے:

مدینے کو جاتا ہے ماہِ رسالت
ملا ربِ کعبہ سے فرمانِ ہجرت
اٹھائے ہے صدیق بارِ نبوت
صداقت کی آغوش میں ہے محبت
یہ نورِ علی نور کی شان دیکھو
صداقت کے پہلو میں ایمان دیکھو
شہنشاہِ کونین نکلا جو گھر سے
دھواں سوزِ فرقت کا اٹھا جگر سے
زمیں سے زماں سے شجر سے حجر سے
اٹھا شور کعبہ کی دیوار و در سے
چلا تو کہاں رب کے گھر کے اجالے
نہ جا چھوڑ کر ہم کو اے جانے والے
مدینے میں اب آمدِ مصطفیٰ ہے
جدھر سنیے آواز، صلی علیٰ ہے
مدینے کا گلزار جنت بنا ہے
مبارک سلامت کا غل ہو رہا ہے
شجر کہہ رہا ہے سلام علیکم
حجر کہہ رہا ہے سلام علیکم

دورِ جدید کے شعرائے دکن میں زیبؔ غوری ایک اہم نام ہے، جس کے اسلوب و آہنگ میں تہہ داری، رمزیت و علامت، کے ساتھ معنویت اور کوزہ میں دریا کو بھر دینے کی قوت موجود ہے۔ اسلوب و آہنگ کی یہ انفرادیت ان کے نعتیہ سرمایے میں بھی موجود ہے۔ زیبؔ غوری کی نعتوں میں ایمان و یقین کی پختگی، عقیدت و محبت کی شگفتگی، جذبات کی وارفتگی اور منبعِ نعت کی عظمت و جلالت کا شعور اور نعت کے ذریعۂ نجات ہونے کا احساس ہر جگہ موجود ہے:

اس قدر ہوش اے چاہنے والے رکھنا
دیکھنا اس کو تو کچھ پردے بھی ڈالے رکھنا
وہ حرم تھا وہاں گنجائشِ مستی تھی بہت
یہ مدینہ ہے، یہاں خود کو سنبھالے رکھنا
کام آجائیں یہی اشکِ ندامت شاید
یہ گہر دل کے کسی کونے میں ڈالے رکھنا

اس کے قدموں میں گرے ریت کی دیوار سے وہ
سہل تھا جن پہ پہاڑوں کو سنبھالے رکھنا
ہاتھ رکھنا وہ تہی دستوں کے سر پر اس کا
کہیں صحراؤں میں چشمے کہیں لالے رکھنا
عرش سی پاک زمینوں پہ قدم رکھو گے
زیبؔ یہ سوئے ادب ہے اسے ٹالے رکھنا

ایک دوسرے شاعر شاذؔ تمکنت کی ایک نعتیہ نظم پیشِ خدمت ہے، جس میں شاعر بارگاہِ نبوی میں حاضری، خاموشی اور تنہائی میں ملنے اور فریادیں پیش کرنے کی تمنا کرتا ہے۔ چند بند دیکھیے جو اپنی تاثیر، شگفتگی اور بصیرت کے لیے لاجواب اور فکر وفن کا شہکار ہے۔

آپ اکیلے مل جائیں تو
دامن تھام کے رولوں گا

دنیا جیسے ایک کھلونا
ہر پہلو رنگین سلونا

عمر کٹی ہے سمجھانے میں
اپنے آپ کو بہلانے میں

دفترِ حسرت اپنے خدا کے آگے کیسے کھولوں گا
آپ اکیلے مل جائیں تو دامن تھام کے رولوں گا

شاذؔ وطن میں بے وطنی ہے
آگے دیکھو چھاؤں گھنی ہے

ہجر کا قصہ پاک کرو بھی
دامنِ جاں اب چاک کرو بھی

عمر کی رات آنکھوں میں کٹی ہے پل دو پل کو سولوں گا
آپ اکیلے مل جائیں تو دامن تھام کے رولوں گا

دورِ جدید کے دکن میں نعتیہ شاعری کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ہے۔ اس کا ثبوت حیدرآباد میں منعقد ہونے والے وہ نعتیہ مشاعرے ہیں، جن میں پچاس پچاس شعرا شریک ہوتے ہیں اور اپنی نعت گوئی اور نعت خوانی سے عوام و خواص کو بے حد متاثر کرتے ہیں۔ ان شعرا کے نعتیہ دواوین و انتخابات بھی بڑی تعداد میں شائع ہو رہے ہیں۔ خاص طور سے ادبِ اسلامی سے وابستہ شعرا کی آواز نے اسمِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نعرۂ نصرت میں بدل دیا ہے۔ یہ ایک بڑا ہی وسیع و عریض موضوع ہے، جس پر نہ صرف ایک مضمون بلکہ ایک ضخیم تحقیقی مقالے کی ضرورت ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆

☆☆

اورنگ آباد کے نعت گو

ڈاکٹر عبدالرشید ندوی مدنی

شاعری کے طویل سفر کے بعد اسلام کی صبح نمودار ہوئی اور قدرت کی فیاضیوں نے خلاصۂ کائنات، فخرِ موجودات کے وجودِ اقدس سے دنیا کو زینت عطا کی تو شاعری میں بھی ایک نئے باب کا آغاز ہوگیا۔ نورِ رسالت کی تابانیوں نے ذہن کا پورا سانچہ اور زندگی کا پورا ڈھانچہ بدل دیا۔ دنیا بدل گئی، دل پلٹ گیے، زندگی آداب سے آشنا ہوئی، فکر ونظر کے زاویوں نے پلٹا کھایا، جانچنے اور پرکھنے کی میزانِ نو قائم ہوگئی تو وصف نگاری نے نئے اصولوں کی روشنی میں نئی راہیں اپنائیں اور شاعری کی اصناف میں سب سے بہتر، سب پر برتر مدیحِ نبوی کا آغاز ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو کفر کی ظلمت سے نکال کر نور وایمان کی ٹھنڈی چھاؤں عطا کی۔ بھٹکتی اور سسکتی انسانیت کو جینے کا حوصلہ سکھایا۔ آپ کے لبوں کی جنبش سے نطق وگویائی کو پاکیزگی ملی اور آپ کے افعال واعمال نے سلیقہ مندی وشائستگی کے ہنر سکھائے۔ اسی پاکیزگی کے گہوارے میں نعتیہ شاعری کی پرورش ہوئی۔ اور اسی کی بدولت شاعرانہ احساسات وجذبات، افکار وخیالات کو حسنِ ادب کی سوغات نصیب ہوئی۔ نعت گوئی فکر کی پاکیزگی کا مظہر، حبِ نبی ایمان کی علامت، اور تذکرۂ نبی روح کی غذا اور عند اللہ اجر وثواب کا موجب ہے۔ نعت نسبتِ ربِ کائنات کی آئینہ دار ہے۔ اسی لیے ہر عاشقِ صادق نے روح کی تپش، دل کا سوز، عشق کی حرارت اور محبت کی تمام ادائیں اور زبان کی تمام فصاحتیں اسی ذاتِ مجموعۂ صفات وکمالات پر قربان کرنے کو اپنی زندگی کا نصب العین گردانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعرائے اردو عہدِ قدیم ہی سے اپنے دواوین وکلیات کا آغاز حمد، نعت اور منقبت سے کرتے آئے ہیں۔ محسنؔ کاکوری اردو کے وہ بڑے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کا موضوع صرف وصرف نعت ومنقبت ہی کو بنایا ہے۔ کہتے ہیں:

ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی
نہ مرا شعر، نہ قطعہ، نہ قصیدہ، نہ غزل

نعت جتنی مقدس اور جتنی شیریں صنفِ سخن ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ اتنی ہی نازک بھی ہے۔ یہ اس ذاتِ گرامی کا تذکرہ ہے جس کی عظمت وتقدس کے آگے فرشتوں کی گردنیں بھی خم ہیں۔

شعراءِ اورنگ آباد نے اس وادیٔ پُرخار میں اپنے علم ودانست کے مطابق قدم رکھا اور بڑی حد تک اپنے قلم کو لغزشوں

سے پاک رکھنے کی کوششیں کرتے رہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ نعت گوئی توفیقِ خدا اور فیضِ روحانی کے بغیر ممکن نہیں۔ ولؔی اورنگ آبادی کے نعتیہ اشعار آپ سے گہرے اور روحانی و جذباتی تعلق کے آئینہ دار ہیں۔ دنیا کی ہر شے جان و مال، اہل وعیال آپ پر نچھاور کرتے نظر آتے ہیں جو ایمان کا حصہ بھی ہے اور کامل مومن کی سند بھی۔ ملاحظہ ہو:

یا محمد دوجہاں کی عید ہے تجھ ذات سوں
خلق کوں لازم ہے جیو کوں تجھ پہ قربانی کرے
جس مکان میں ہے تمھاری فکر روشن جلوہ گر
عقل اول آکے واں اقرارِ نادانی کرے
عارفاں بولیں گے جاں دل سوں لاکھوں آفریں
جب ولی تیری مدح میں گوہر افشانی کرے

سراجؔ اورنگ آبادی (۱۷۶۳) کو ولؔی اورنگ آبادی کے جانشیں کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ سراجؔ نے ولؔی کی شعری روایات کو مزید استحکام بخشا۔ ان کی شاعری اظہار کی سادگی اور بے ساختگی سے جڑی ہے۔ وہ ذاتِ والا صفات میں اپنی حقیقت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

رسولِ خدا سید المرسلیں
قیامت کے دن شافع المذنبیں
نبوت کی مسند کا ہے جانشیں
کیا جس کی تعظیم روح الامیں
عجب روزِ محشر کا سردار ہے
صفِ انبیا میں وہ سالار ہے
شہادت کی انگلی دکھا یک بیک
کیا چاند جب شق، کیا اون کا شک
زباں کو کہاں تابِ گفت و شنید
ہے جس کی صفت میں کلامِ مجید

پچھی نارائن شفیقؔ جو سراجؔ اور داورؔ اورنگ آبادی کے ہم عصر ہیں اور جنھیں مولانا غلام علی آزادؔ بلگرامی سے فیض حاصل ہے، انھوں نے ۱۰۶ اشعار پر مشتمل معراج نامہ قلم بند کیا جو حضور (ﷺ) سے گہری وابستگی و عقیدت کا مظہر ہے:

عجب رات تھی وہ نور افشاں
کہ ہر کوکب تھا اک مہرِ درخشاں
کہوں گر رات اس کو ہے تامل
کہوں گر دن تو عالم میں پڑے غل

صفؔی اورنگ آبادی کا تعلق دبستانِ داغؔ سے تھا۔ سہل ممتنع کے ساتھ ساتھ دکنی الفاظ اور محاوروں کا استعمال ان کے کلام کی انفرادیت ہے۔ ان کی شاعری میں محاوروں کی چستی، روشن ضمیری اور صدق وصفا کا انعکاس ملتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر یقینِ کامل کے ساتھ آپ کی غلامی کو سعادت تصور کرتے ہیں:

صفؔی کی آبرو ہے آپ کے ہاتھ
برا ہے یا بھلا ہے آپ کا ہے

ظہورِ قدسی سے جب کائنات جھوم اٹھی اور جاں

بلب انسانیت نے جھرجھری لیتے ہوئے جب استقامت لی تو اس کو اختر الزماں ناصر نے یوں منظوم کیا:

لو کرن پھوٹی سویرا ہوگیا
ہجر کا بیمار اچھا ہوگیا
پھوٹ نکلا خشک مٹی سے گلاب
ریت کے ذروں سے اگلا آفتاب
حسنِ اجسام کو کوئی دہکا گیا
آفتابوں کو پسینہ آگیا
گیسوئے فطرت سنوارے جائیں گے
اب نئے سورج ابھارے جائیں گے
وقت کی رفتار میں فرق آجائیگا
اب زمانہ تیز ہوتا جائیگا
خاک بھی اب حسن پہ اترائے گی
کہکشاں ذروں میں ٹانکی جائے گی

حکیم سعید الدین افسر (۱۹۱۲-۱۹۸۴) روایت پسند صوفی شاعر، ﴿من یطع الرسول فقد أطاع الله﴾ کی ترجمانی دیکھیے:

افسر میں سمجھتا ہوں ہے اس کا یقیں مجھ کو
جو ان کا ہوا بندہ ، وہ بندہ خدا کا ہے

حضرت تاج اورنگ آبادی کا شمار ادب کے اہم خدمت گزاروں میں ہے، آزادی کے بعد دگرگوں حالات سے نبرد آزما ہونے اور ادبی جمود کو توڑنے میں ان کے رسالے ''نقشِ نو'' نے اہم رول ادا کیا۔ قاضی تاج الدین کی زندگی کے نصب العین کا اندازہ ان کے مجموعۂ کلام ''آئینۂ احساس'' کے حرفِ مدعا سے ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: انسان نام ہے احساسات کی تحریک کے ساتھ شعور وادراک اور سلامت روی سے زندگی بسر کرنے والے کا اور فکر و وجدان کی صفت کے طفیل مثبت نصب العین پر خود سپردگی و جانبازی کے عملی مظاہرہ کرنے کا۔ نعت احترامِ آدمیت اس شخصیت کے تئیں خراجِ عقیدت ہے جو ان کی بصیرت کا ماخذ ہے:

نگاہِ شوق میں جب جلوۂ ماہِ تمام آیا
مٹی تاریکیِ غم اور محبت کا پیام آیا
مقدر کے ستاروں نے بھی گردش روک دی اپنی
بنامِ آدمیت جب پیامِ احترام آیا
سلام اس پر کہ جس کا نقشِ پا ہے آج تک روشن
جو اس تک رہرو منزل سلامت تیز گام آیا

قاضی سلیم (۱۹۲۷-۲۰۰۵) کی شاعری کا کینوس بڑا وسیع ہے۔ انھوں نے اپنی ایک نعت میں عہدِ جہالت کا منظر نامہ اور پھر آمدِ رسول (ﷺ) کی بدولت سسکتی انسانیت اور بھٹکتے ذہنوں کی یکسوئی کا مؤثر نقشہ کھینچا ہے۔ اپنی بات نظم کرتے ہوئے وہ عہدِ جدید کا باب وا کرتے ہیں تو انھیں سوائے بے سمتی کے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ دیکھتے ہیں کہ پیغامِ ربانی جس کو انتہائی انضباط کے ساتھ آپ نے ہمیں ذہن نشیں کرایا تھا، ہمارے تغافل کا شکار ہوا۔ نتیجتاً تنزل و ادبار نے ہمیں آ

گھیرا اور مادیت و چمک دمک نے ہماری آنکھیں خیرہ کردیں، اور اسی مادہ پرستی نے حق شناسی کے راستے محدود کردیئے۔ قاضی سلیم اسلام کی پیروی ہی میں انسانیت کی بقا کا راز سمجھتے ہیں اور اسی کو انسانیت کی نجات دہندہ گردانتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

یا محمد مصطفیٰ یا حبیبِ کبریا
ہم گناہ گار و حقیر الجھنوں میں تھے اسیر
حق کو پانے کے لیے دربدر بھٹکا کیے
کھو گیے ظلمات میں گھر گیے آفات میں
یا محمد مصطفیٰ یا حبیبِ کبریا
آپ کا ہر نقشِ پا تھا چراغِ رہنما
رسم و راہِ آزری ہر طلسمِ سامری
سارے گمراہی کے جال بن گیے خواب و خیال
یا نبی خیر الانام یا نبی عالی مقام
یا محمد مصطفیٰ پھر سے میرے عہد کا
آدمی ہے تشنہ کام کیسا بے گھر بے مقام
فلسفے بے روح تھے اپنے رب سے کیا ہٹے
انفس و آفاق کے سارے رشتے کٹ گیے
خود غرض صیدِ ہوس ذات اپنی خود قفس
نورِ ایماں نظمِ دیں اعلیٰ قدریں دل نشیں
وہ محبت و یقیں کچھ نہیں اب کچھ نہیں
پھر وہی سفاکیاں پھر وہی بربادیاں
خود ہی اپنے جال میں عقل کے جنجال میں
پھنس کے بے نیل و مرام ہے مشینوں کا غلام
دیو زادے بے لگام تابکاری کا نظام
چاند سورج اور نجوم کہکشانوں کے ہجوم
لاکھوں نوری سال پر پھیلے ہوئے ہیں سب مگر
اک منظم کارواں ہے سلیقے سے رواں
عقل ان کے درمیاں رہ گئی بن کے دھواں
زعمِ دانش مٹ گیا آنکھ سے پردہ ہٹ گیا
اے شفیعِ محترم ہو کے نادم آج ہم
سرنگوں با چشمِ نم لے کے امیدِ کرم
پھر مدینے کی طرف آرہے ہیں صف بہ صف
یا محمد مصطفیٰ یا حبیبِ کبریا
تاجدارِ انبیا جلوۂ نورِ خدا
رحمۃ للعالمیں آپ پر تکمیلِ دیں
صاحبِ قرآن آپ منزلِ عرفان آپ
مرہم اور جان آپ دردِ ہم درمان آپ
پھر کرم فرمایئے راستہ دکھلایئے
ڈھونڈتی ہے کائنات آج پھر راہِ نجات
یا نبی خیر الانام یا نبی عالی مقام
آپ پر لاکھوں سلام آپ پر لاکھوں سلام

بشر نواز جدید اردو شاعری کے بنیاد گزاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ بشر نواز کا کہنا ہے کہ جدیدیت قطعی روایت سے انحراف نہیں بلکہ کسی بھی موضوع پر اظہار جو روایت سے

ہٹ کر ہوگا، جدیدیت کے زمرے میں گردانا جائے گا۔ فکر کے نئے افق، تشبیہات اور استعارے جو عصرِ حاضر کی تیز رفتار تبدیلیوں اور نئے انکشافات و تجربات کی عطا ہے، یہ وہ عوامل ہیں جن کے استعمال نے نعت کو نیا پن اور نئی فضا و تازگی کے احساس سے مزین کیا ہے:

بھلا وہ اسم کیسے قیدِ حرف و صوت میں آئے
صفت ایک ایک جس کی کائناتوں کا احاطہ ہے
وہ نور النور عقلِ اول و انسانِ کامل ہے
وہ سیلِ فیض موج رحم ہے قرآن کا حامل ہے

وہ کہتے ہیں:

بھلا میں وصف اس اسمِ معظم کا لکھوں کیسے
لکھوں تو اپنے عجز و نارسائی کا بیاں لکھوں
لکھوں کس طرح خود اپنے پہ میں نے ظلم ڈھائے ہیں
کن اندھیاروں میں بھٹکا ہوں کہاں سجدے لٹائے ہیں
لکھوں اس کی دکھائی رہ پہ جن قدموں کو چلنا تھا
وہ حرص و آز کے کن کن بیابانوں میں بھٹکے ہیں
وہ نظریں جن کو شمعِ حق سے کسبِ فیض کرنا تھا
الجھ کر منظرِ باطل میں کیسے خود کو کھو بیٹھے
بتاؤں کیا کہ جن موجوں کو میں نے ناخدا جانا
کہاں لے جاکے میری کشتیٔ ایقاں ڈبو بیٹھے
میں اپنے آپ کا مجرم میں خود اپنے آپ پہ شرمندہ
اٹھاؤں آنکھ تو کیسے زباں کھولوں تو کیا بولوں

بشر نوازؔ اپنی بے بصیرتی، گمرہی، بے یقینی اور بے سرمائیگی کا ذکر کرتے ہیں، کوتاہیوں کا انھیں اعتراف ہے، یہ تاثرات و جذبات جو احساسِ باطن کے آئینہ دار ہیں، کلامِ موزوں بن کر جب قرطاس پر سجتے ہیں تو ذاتی احساس ندامت تک محدود نہیں رہتا، بلکہ یہ کرب پوری امت کا کرب بن جاتا ہے۔ یہاں شاعر کا احساسِ ندامت اس کو خود اعتمادی بخشتا ہے۔ اس بات پر اسے یقینِ کامل ہے کہ آپ (ﷺ) ہی وہ ابرِ کرم ہیں جس کو رحمۃ للعالمین سے مخاطب کیا گیا اور جسے محبوبِ رب المشرقین والمغربین کے خطاب سے نوازا گیا۔

جے۔ پی۔ سعیدؔ کے شعری افکار صالح اقدار پر قائم ہیں جو فنی مہارت اور استادانہ کلام کی آئینہ دار ہیں۔ جے۔ پی۔ سعیدؔ کا کلام جذبۂ عقیدت کا والہانہ اظہار ہے:

انھیں کا آسرا ہم کو ہے دنیا اور عقبیٰ میں
ہمیں ہے ناز اس پر ہم اسی آقا کی امت ہیں

میر ہاشمؔ کی نرم خوئی اور رقیق القلبی نے ان کے لہجے کو جو ندرت بخشی، اس کا احساس ہمیں ان کی نعت میں ہوتا ہے:

توقیرِ ذات وذہنِ رسا دے گیا مجھے
جو چاہیے تھا اس سے سوا دے گیا مجھے
رسوا سرِ نیاز تھا کس طرح کو بہ کو
وہ کون تھا جو درسِ وفا دے گیا مجھے
اب تک ہے دست سنگِ ندامت سے سرنگوں
وہ شخص زخم کھا کے دعا دے گیا مجھے

اک اک لفظ مخزنِ عرفان و آگہی
دونوں جہاں کا کون پتہ دے گیا مجھے
صحرائے شب میں جیسے ستاروں کا سلسلہ
نقشِ قدم و آبلہ پا دے گیا مجھے

ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ نے نعت گوئی میں بڑا مقام حاصل کیا۔ ان کی فکر نے توحید و رسالت کے حدود میں رہ کر ہمیشہ مقامِ نبوت کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی:

وہ ملائک ہوں کہ جن و انس اشجار و حجر
ہیں سبھی مداح تیرے کورکر کو چھوڑکر
تیرے دعوے کی صداقت کا ہے کافی یہ ثبوت
تھا نبوت سے بھی پہلے قول تیرا معتبر
توڑکر تونے بتانِ رنگ و نسل و قومیت
کردیئے خم اپنے آگے قیصر و کسریٰ کے سر
یہ ابوبکر و عمر وہ علی عثمان ہیں
کیسے کیسے جانشیں نکلے ہیں تیرے نامور
ہم سیہ کارانِ ہندی ہیں رمق اتنی تو ہے
آنچ تک آنے نہیں دیتے ہیں تیرے نام پر
ہے یہ دیرینہ تمنا عصمت جاوید کی
تیری مدحت میں جتائیں کچھ تو سامانِ سفر

نعتِ نبوی میں ادنیٰ قسم کا غلو نعت کو غیر مؤثر بنادیتا ہے، اس کا سب سے نمایاں پہلو ذات وصفات میں اعتدال ہے۔ شاہ حسین نہریؔ نے کس طرح احتیاط کو ملحوظ رکھا:

رتبے میں مصطفیٰ کے نہیں دوسرا شریک
اللہ نے بنایا نہیں آپ کا شریک
اللہ لا شریک ہے معبود آپ کا
بندے خدا کے آپ ہیں بندوں میں لاشریک

اللہ رب العزت کی کبریائی کے اعتراف کے بعد آپ پر ایمان لانا ایمان کا جز ہے۔ مقدس ذاتِ گرامی کا تذکرہ باعثِ نجات بھی ہے اور بلندی درجات کا سبب بھی۔ فاروق شمیم کی انفرادیت ان کی نعت سے جھلکتی ہے:

جہاں بھی سرورِ عالم کی بات ہوتی ہے
اجالا بولتا ہے، نور کی برسات ہوتی ہے
درِ اقدس پہ حاضری ہو بس یہی دھن ہے
اسی میں دن نکلتا ہے، اسی میں رات ہوتی ہے
جہاں بھی اسوۂ حسنہ کا دامن ہاتھ سے چھوٹے
نمایاں اور بھی کچھ گردشِ حالات ہوتی ہے
جو لمحے پیروی سنت نبوی سے ہوں عاری
وہیں پر زندگی کی زندگی سے مات ہوتی ہے
کہاں نعتِ نبی اور بندۂ عاجز کہاں فاروقؔ
مگر الفاظ میں جذبات کی سوغات ہوتی ہے

خان شمیم آزاد نظم کے پکے شاعر ہیں۔ انھوں نے نظم کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ وہ نظم کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

میرے اللہ مجھے، حسان ثابت کا جذبہ دے، قلم کو نور دے
قلب ونظر کو آگہی دیدے، نئے الفاظ دے، الفاظ کو معنی عطا کر
مجھے بس ایک دلِ آگاہ خیر الانبیا دیدے، میں نعت پاک کہنا چاہتا ہوں
مری دھڑکن، حضورِ رحمتِ عالم کی سیرت میں بدل جائے، میرا کردار
احمد مصطفیٰ کا آئینہ بن جائے، مرا جینا مرا مرنا، میسر ایک ایک لمحہ
حیاتِ طیبہ کی نقل ہو جائے، مری نسلیں ان کے عشق میں سرشار ہو جائیں
مری دنیا نسیمِ فیض سے مہکے، مری عقبیٰ شفاعت ریز ہو، گلپوش ہو جائے
میں اپنی موت سے پہلے ہی جینا سیکھ لوں، یارب، جمالِ مصطفیٰ آنکھوں میں بس جائے
میرا سینہ تسلی ریز ہو جائے، تخیل خیز ہو جائے، تصرف بیز ہو جائے
میں چپکے چپکے صدقہ دوں، یتیموں کے سروں پر ہاتھ رکھوں، پڑوسی کی خبر گیری کروں
مریضوں سے ملوں، دکھ درد بانٹوں، غریب و بے کس و بیوہ کی پرسش کر سکوں
زمیں پر جب چلوں ہر اک قدم پر انکساری، نظر نیچی رہے، مرے ستار مجھ کو
میرے سارے حق ادا کرنے کی طاقت دے، میں دینِ احمد و محمود و حامد کا سپاہی ہوں
سپہ گر ہوں، مجاہد بھی بنا دے، طبیبِ دو جہاں نورِ مجسم صاحبِ رفعت
شہر کیمیا کی ریت آنکھوں میں بھروں، اور عاقبت پالوں، امانتدار بن جاؤں
مجھے محروم جو رکھے، اسے میں خود عطا کر دوں، جو مجھ سے ٹوٹنا چاہے، اسے میں جوڑتا جاؤں
جو مجھ پر ظلم آمادہ ہو، اس کو عفو بھی کر دوں، مرے اس جسمِ خاکی پر، ہو میری روح کا غلبہ
مجھے قلت میں کثرت دے، میں حق کے معرکے میں پیٹھ نہ پھیروں، میں صلح و آشتی کا درس دوں
مرا موجد جائے امن بن جائے، مجھے رفتار سے گفتار سے کردار سے مومن بنا دے، مجھے پھر معتبر کر دے
مرے اللہ مجھے حسان بن ثابت کا جذبہ دے، میں نعتِ پاک کہنا چاہتا ہوں

انسانی خدمت میں ''صحافت'' کا حصہ

حضرت مولانا مفتی سید باقر ارشد

صحافت کا اولین فریضہ عوام کی خدمت ہے۔ سماج میں اس کی حیثیت ایک اہم ادارے کی ہے۔ اپنی کتاب '' اسلامی صحافت'' میں ڈاکٹر عبدالسلام لکھتے ہیں:'' اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو تازہ ترین خبروں سے آگاہ کیا جائے، عصر حاضر کے واقعات کی تشریح کی جائے اوران کا پس منظر واضح کیا جائے تا کہ رائے عامہ کی تشکیل کا راستہ صاف ہو۔ صحافت رائے عامہ کی ترجمان اور عکاس بھی ہوتی ہے اور رائے عامہ کی رہنمائی کے فرائض بھی سرانجام دیتی ہے۔ عوام کی خدمت اس کا مقدس فریضہ ہے، اس لیے صحافت معاشرے کے ایک اہم ادارے کی حیثیت رکھتی ہے''۔(اسلامی صحافت ص ۴۰)۔

صحافت کا مقصد جب عوام کی خدمت ہے تو کوئی ایسا اقدام جو عوام کے لیے نقصان دہ ہو؛ اٹھانا صحافت وصحافی کے لیے جائز نہیں۔ چنانچہ صحافت وصحافی کا کام صرف خبریں پہونچادینا، یا کسی واقعے کے سلسلے میں محض رائے عامہ تیار کردینا نہیں، بلکہ جو اخبار یا مواد دیا جارہا ہو وہ سماج ومعاشرے کے نظریات سے مطابقت رکھتا ہو، اصول واقدار حیات سے ہم آہنگ ہو، حیات انسانی اور اخلاق انسانی کو، تہذیب انسانی کو، انسانی معاشرے کو تقویت پہونچانے والا ہو۔ دوسرے الفاظ میں صحافت وصحافی کا کام یہ ہے کہ وہ معاشرے کی شیرازہ بندی، معاشرے میں مساوات، اخوت، بھائی چارہ اور عدل وانصاف کے لیے اور ملک وقوم کی ترقی وبہبود کے لیے راہیں ہموار کرے، ملک کے باشندوں میں خود اعتمادی اور آپس میں ایک دوسرے پر خوش اعتباری استوار ہو۔ یکجہتی کا ماحول ہو، غیر اخلاقی وبدکرداری جیسی بیماریوں کا علاج ہو۔

صحافت کا مقصد قرآن کی اس آیت کریمہ میں واضح ہے:﴿ کنتم خیر أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنکر و تؤمنون بالله﴾ (آل عمران:۱۱۰)۔ اسلام نے صحافت کی افادیت کو، معاشرے میں اس کی ضرورت کو اور سماج میں اس کی اہمیت کو محسوس کیا اور معروف کی تلقین اور منکر سے اجتناب کی تعلیم کی راہ ہموار کرنے کا حکم دیا۔

یہ اسلام کے اصولوں میں داخل ہے کہ رائے عامہ کی ترجمانی احسن طریقے سے اور ایمان داری سے اور مثبت انداز سے کی جائے۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ماننے والوں کو﴿ بلغوا عنی و لو آیة ﴾ کا حکم دے کر اسلامی صحافت کی بنیاد ڈالی ہے۔ اسلامی تاریخ میں یہ بات محفوظ ہے اور دنیا نے بھی اسے محسوس کیا کہ اسلام نے، اسلامی تعلیمات کو ماننے والوں نے ہمیشہ صحافت کے ذریعے سے انسانیت کی خدمت کی ہے اور انسانیت کو مجروح ہونے سے بچایا ہے۔

خدمت انسانی صحافت کا اصول اور بنیادی فریضہ رہا

ہے۔صحافت نے ہمیشہ انسانیت کی خدمت کی ہے۔چاہے وہ عالمی سطح کے معاملات و واقعات ہوں یا ملکی سطح کے۔عالمی سطح پر جتنے بھی انقلابات آئے ہیں،ان میں صحافت نے ایک اہم اور مثبت رول ادا کیا ہے۔صحافت نے اہم موقعوں پر رائے عامہ کی ترجمانی کی ہے۔کہیں اور کی نہیں،ہم اسی ملک کی بات کرتے ہیں کہ یہ ملک انگریزوں کی غلامی میں رہا،محکومانہ زندگی گذارنے پر اس ملک کے باشندے مجبور تھے،اس ملک کے باشندوں کی آرزوئیں سرد،ارمان بے جان اور تمنائیں مایوسی کے غبار سے اٹی ہوئی تھیں۔اس وقت یہی صحافت تھی جس نے ان کی آرزوؤں میں جان بھردی،ان کے ارمانوں کو پھر سے جگایا،ان میں ولولہ و جوش، امنگ اور حصول آزادی کی ترنگ بھردی۔صحافت نے انقلاب برپا کردیا۔چاہے وہ ابوالکلام ہوں یا حسرت موہانی،مولانا حالی ہوں یا مولانا محمد علی جوہر،حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری ہوں یا شورش کاشمیری الغرض یہ ملک وملت کے مانے ہوئے صحافی تھے جنہوں نے آزادی کی سرد چنگاری کو ہوا دی۔اور وہ چنگاری بڑھتے بڑھتے شعلہ بنی جس سے انگریزی سامراج جل کر راکھ ہوگیا۔

ہمارے ملک کو آزاد کرانے میں صحافت نے اہم کردار ادا کیا ہے۔چاہے وہ ابوالکلام آزاد کا الہلال یا البلاغ ہو یا یہاں کے دوسرے اخبارات؛ ان اخبارات نے مسلسل زبردستی قابض انگریزی حکومت کے مفادات پر اپنے انقلابی تیور کے ساتھ کاری ضرب لگائی جس کے نتیجے میں ملک کے باشندوں میں شعور بیدار ہوا،اپنے ہی ملک میں غلامی کی زندگی بتانے کے عادی ہوجانے والے ذہنوں کی سلوٹوں میں ایک امنگ آزادی کی جاگی،مسلسل غلامی ومحکومی نے جن دلوں پر غفلت طاری کردی تھی ، ان جیسے اخبارات سے ان دلوں میں ہلچل پیدا ہوئی پھر ملک میں وہ انقلاب آیا جس کا تتمہ ملک کی ''آزادی'' پر ہوا۔

صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا بالخصوص یورپ اور عرب ممالک میں صحافت اور صحافی حضرات ہی ہیں جنہوں نے شعور اور بیداری لانے کا کام کیا۔صحافت نے عوام کو ایک دوسرے سے جوڑا،ایک دوسرے کے اندر محبت ،اخوت، بھائی چارہ قائم کیا، ایک دوسرے کے تئیں احساس ذمہ داری پیدا کیا،ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے کا موقع دیا،اپنے اپنے علاقے اور خطے میں، اپنے علاقے سے باہر،ملک وبیرون ملک کے لوگوں کو جاننے ، پرکھنے اور ان سے قریب ہونے کا موقع دیا۔یہ صحافت ہی ہے جس نے اپنے ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے ایک جگہ کے انسانوں کی خصوصیات کو دوسری جگہ کے انسانوں تک پہونچایا،ایک جگہ کے حالات اور خصوصیات کو دوسری جگہ پہونچایا جس کی وجہ سے انسانوں میں تال میل بڑھا، تعلقات بڑھے،ایک دوسرے سے استفادے کی روایت قائم ہوئی اور پھر دنیا بھر میں ایک دوسرے کے مفادات کا لین دین شروع ہوا۔

انسان کی بنیادی ضروریات ہوا ، پانی، غذا، کپڑا اور چھت ہیں،ان کے میسر ہوجانے اور اپنے گھر سے مطمئن ہوجانے کے بعد آدمی کو اپنے اطراف کو جاننے ، اس کو سمجھنے اور اس سے استفادہ کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے،ان تمام ضروریات کی فراہمی کے بعد وہ اپنے اطراف پر نظر ڈالنا پسند کرتا ہے تاکہ وہ اندرون کے ساتھ ساتھ اپنے بیرون سے بھی استفادہ کرے اور اپنی ذات سے اپنے بیرونی وخارجی مسائل کو حل کرے۔اور یہ کام صحافت کرتی ہے کہ آدمی اپنے اطراف واکناف سے واقفیت حاصل کرتا ہے اور اس کا ادراک حاصل کرتا ہے۔

آج ہمارے ہاں جو انسانیت دشمن ماحول بنتا جارہا ہے،

اخوت، بھائی چارہ، مساوات، احترام آدمیت وتکریم انسانیت اٹھتے جارہے ہیں، ﴿یفسد فیھا و یسفک الدماء﴾ کی منہ بولتی تصویر انسان بنتا جارہا ہے۔ معاشرے وسماج میں ایک دوسرے کے خلاف زہرافشانی، الزام تراشی کی روایت چل پڑی ہے، افواہوں، غلط بیانیوں، واقعات کوتوڑموڑ کر پیش کرنے کا ایک "عالمی فیشن" بن چکا ہے، اس کے لیے پوری قوت کے ساتھ صحافت، صحافی، جرنلزم، جرنلسٹ اور میڈیا کا پرزور طریقے سے اور کھلم کھلا استعمال بلکہ استحصال کیا جارہا ہے۔ جب سے صحافت "جرنلزم" سے "میڈیا" بنی، جب سے صحافت "کارپوریٹ"، بنی، اس صحافت پر زردی چھانے لگی، اور اس کا بے دریغ استعمال اپنے مفادات کے لیے زور آور فریق کرنے لگا۔ اب چند ایک کی بلکہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے یہ عام تأثر بنتا جارہا ہے کہ اب صحافت آزاد نہیں ہے، صحافت خبروں اور واقعات کی عکاس نہیں ہے، رائے عامہ کی ترجمان نہیں ہے بلکہ اب صحافت ایک انڈسٹری ہے، ایک تجارت ہے، اب وہ زور آور و پاور فل طبقے کی غلام ومحکوم بنتی جارہی ہے چہ جائیکہ وہ منفی وغلط اور انسانی معاشرے کے اصولوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ آج عالمی سطح پر صحافت کا اپنے اپنے مفادات، کمزوروں کو مزید کمزور بنانے، کمزور طبقات کی شبیہ کو بگاڑنے، واقعات کی غلط و مجرمانہ عکاسی کرنے کے لیے استعمال ہورہا ہے۔

المیہ یہ ہے کہ فی زمانہ صحافت اپنے بنیادی اصولوں اور مقاصد سے ہٹ کر رہ گئی ہے۔ صحافت کی جگہ "زرد صحافت" نے لے لی ہے جس کے نتیجے میں عوام کی رائے، رائے عامہ کی غلط ترجمانی دھڑلے سے کی جارہی ہے، عوام کو، ملک کو، قوم کو غلط اطلاعات، جھوٹی خبریں، مہیاء کرائی جارہی ہیں جس سے انسانی معاشرہ اور انسانی سماج میں کمزور طبقات کی حق تلفی عام ہوتی جارہی ہے۔

صحافت ایک آزاد اور خودمختار شعبہ ہے، لیکن مرورزمانہ سے اس کی آزادی کی جگہ غلامی اور طرف داری، جانب داری نے لے لی ہے، اس کی خودمختاری سلب ہوگئی ہے جس کی وجہ سے معاشرے وسماج میں وہ عدل قائم نہیں ہو پارہا ہے جو کہ صحافت کا طرۂ امتیاز تھا۔ ملک کی حکومت اور ملک کی عدالت یہ دونوں ملک کے اہم ستون ہیں۔ صحافت ان دونوں ستونوں تک عوام کی رائے کی ترجمانی، واقعات کے حقائق، وقت کی سچائی پہونچانے کا کام کرتی ہے تاکہ یہ دونوں ادارے اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھاسکیں۔ آج میڈیا معاشرے پر چھایا ہوا ہے، وہ جس کو چاہے اس کو ملزم ومجرم قرار دے دیتا ہے اور جس کو چاہے اس کو کلین چٹ دے دیتا ہے۔ عالمی سطح پر آج صحافت کا غلط استعمال، اپنے اپنے مفادات کے لیے استحصال کیا جارہا ہے۔ عالمی سطح پر بھی اور ملکی سطح پر بھی حالات کے بننے وبگڑنے میں، ماحول کی تیاری میں صحافت کا ایک بڑا رول رہتا ہے، آج اس کا بے جا استعمال بلکہ استحصال زور آور طبقہ اپنے مفادات کے لیے کررہا ہے۔

صحافت کی ذمہ داری اور اس کی خدمت انسانی تقدس اور انسانی معاشرے کی طہارت کا تحفظ بھی ہے۔ آج کے اس پراگندہ ماحول میں جہاں بے حیائی ایک فیشن، بے پردگی ایک آرٹ بن کر رہ گئی ہے، عالمی سطح پر بعض ممالک انسانی فطرت پر مبنی، اخلاق سے مزین "اسلام" کے بنیادی اصول کو چھیڑتے ہوئے بے حیائی کے فروغ، بے پردگی کی تبلیغ وتلقین کرتے ہوئے میڈیا و صحافت کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ ان کے غلط عزائم کا پروپیگنڈہ صحافت ہی سے ہورہا ہے مگر اس بات پر اطمینان ہے کہ زرد صحافت کی چلائی ہوئی اس مہم کی کمر توڑنے میں مقصدی ومثبت صحافت نے بڑا کام کیا ہے اور کررہی ہے۔ ☆☆☆☆

آہ ارضِ فلسطین!

شمسی قریشی

یہ انبیا کی سرزمیں — پیامِ امن کی امیں — یہیں کا سر تو معرکہ — بغیر کشت وخون ہوا
رسولوں کے ورود کا — مقام ہست و بود کا — مگر یہ اب غلام ہے — زمیں یہ زیرِ دام ہے
زمین یہ خلیل کی — کلیمِ بے مثیل کی — وطن یہ کل حدود میں — ہے پنجۂ یہود میں
یہ ارض حسنِ یوسفی — یہ سرزمین طور کی — یہود یعنی اشقیا — وہ قاتلانِ انبیا
فضا میں اس کے نور ہے — ترانۂ زبور ہے — وہ سود خوار و فتنہ گر — وہ خوگرانِ مکر و شر
یہ چشمِ حق نما کا تل — یہ ملکۂ سبا کا دل — کسی کو لائے دار تک — کسی کو تیز دھار تک
یہیں ہوا عظیم تر — عذاب قومِ لوط پر — خدا کا ان پہ ہے غضب — یہ ارضِ پاک ہے غصب
جبیں یہیں پہ جھک گئی — تحیر عزیز کی — یہود غاصب و لعیں — مثال دہر میں نہیں
جھکے ہیں سر غرور کے — یہیں پہ نزد و دور کے — وہ چال باز فطرتاً — وہ حیلہ ساز عادتاً
یہیں مسیح آئے تھے — پیامِ امن لائے تھے — نظر میں محترم کہاں — مقامِ پیمبراں
صحیفوں کی زمیں ہے یہ — سفیروں کی زمیں ہے یہ — نہ مولدِ مسیح بس — ہر اک غلط صحیح بس
اسی زمین پر یہیں — ہے قبلہ گاہِ اولیں — وہ صخرۂ جمیل ہو — کہ مسجدِ خلیل ہو
وہ قبلہ گاہِ اولیں — جہاں ہیں برکتیں مکیں — دل و نگاہ کی کھٹک — ہے اولین قبلہ تک
نبی کے مقتدی یہیں — تھے انبیاء و مرسلیں — قبیح ذہن کی اُپج — ہر اک پہ ہے نگاہ کج
یہیں سے عرش کا ہوا — سفر شروع آپ کا — زمینِ قدس کی طلب — کوئی صلاح دیں لقب
یہیں کے واسطے عمرؓ — ہوئے تھے عازمِ سفر — وہ سرزمیں جو پاک تھی — سلامتی کی ناک تھی

جہاں اماں تھی امن تھا
مسرتیں تھیں، جشن تھا
ہر ایک شے ہے بے اماں
ہیں بستیاں دھواں دھواں

اسی زمیں کے مرد و زن
ہوئے بجبر بے وطن
یہ ظلم و جور و خودسری
یہ بے بسی، یہ بے کسی

یہاں جو لوگ رہ گیے
ہیں صرف ظلم سہہ رہے
کراہ، چیخ، درد ہے
مزاجِ دہر سرد ہے

نہ پوچھو ان کے رات دن
ہیں ان پہ کس قدر کٹھن
یہ قوم پس رہی ہے کیوں
جہاں میں بے حسی ہے کیوں

ہر ایک لمحہ حشر ہے
کہیں کفن نہ قبر ہے

اِدھر ہے ڈھال صبر کی
اُدھر ہے تیغ جبر کی
وہ اہلِ ہوش ہیں کہاں
لہو کا جوش ہے کہاں

نہ شیر خوار مرد و زن
جواں نہ پیر سن نہ سَن
کہاں ہیں سرفروش وہ
کہاں ہیں سخت کوش وہ

ہر اک پہ وار بھی کریں
قصوروار بھی کہیں
قدم ثبات کا کہاں
جنوں نجات کا کہاں

کریں یہ گر مظاہرے
تو وہ کریں محاصرے
کہاں گئیں اخوتیں
کہاں گئیں محبتیں

جو اس پہ احتجاج ہو
تو گولیوں کا راج ہو
بصیرتیں کہاں گئیں
حمیتیں کہاں گئیں

جگہ جگہ تلاشیاں
قدم قدم تباہیاں
رفاقتیں کہاں گئیں
حمایتیں کہاں گئیں

علاج کیا دوائیں بند
سرنگ بند راہیں بند
گئیں کہاں قیادتیں
گئیں کہاں شجاعتیں

نہ پہنچیں چیزیں خوردنی
نہ دیکھیں دھوپ چاندنی
کہاں ہے غیرتِ عرب
کہاں عرب عجم ہیں سب

اگر ہو پُرشکن جبیں
مکیں مکاں کچھ نہیں
دلوں کو ہو گیا ہے کیا
لبوں کو ہو گیا ہے کیا

کسی کی آن کچھ نہیں
کسی کی جان کچھ نہیں
بصارتوں کو کیا ہوا
سماعتوں کو کیا ہوا

نہ جان کی نہ مال کی
نہ خیر اسپتال کی
جماعتوں کو کیا ہوا
ریاستوں کو کیا ہوا

نہ درسگاہ بچ سکے
نہ سجدہ گاہ ہی رہے
حکومتوں کو کیا ہوا
عدالتوں کو کیا ہوا

نہ کشت ہے نہ باغ ہے
جو کچھ ہے داغ داغ ہے
زمیں زماں کو کیا ہوا
ارے جہاں کو کیا ہوا

ہے مکر، ہیں عداوتیں
بہیمیت، شقاوتیں
ہے کوئی تو لب کو کھولتا
ہے نہ کوئی رب تو بولتا

عروجِ انتقام ہے
کہاں کا احترام ہے

غزل

سعدیہ صدف
67 مولانا شوکت علی اسٹریٹ، کولکاتہ

زمین میں ہوں ، حسیں آسمان ، یعنی تو
مرا غرور ، مری آن بان ، یعنی تو
مرا حبیب ، مرا مہربان ، یعنی تو
مری وفا کو ملا ہم زبان ، یعنی تو
تصورات کی بے داغ چاندنی شب میں
جسے میں پڑھتی ہوں وہ داستان ، یعنی تو
مجھے جو کہنا تھا وہ تیری آنکھ نے کہہ دی
حدیثِ دل کا مرے ترجمان ، یعنی تو
میں دھوپ دھوپ بلا خوف چلتی پھرتی ہوں
برہنہ سر ہوں ، مرا سائبان، یعنی تو
شبِ فراق نے احساس یہ دلا ہی دیا
مری جوان امنگوں کی جان ، یعنی تو
رہِ حیات میں اب ڈر نہیں بھٹکنے کا
کہ میری سمتِ سفر کا نشان، یعنی تو
اُسے اے سعدیہ آنکھوں سے کہہ دیا میں نے
کہ میری فکر و نظر کا جہان ، یعنی تو

غزل

ڈاکٹر طاہر الدین طاہر
مکرمی ٹولہ، کرنول، صاحب گنج، مظفر پور، بہار

میں تمھارے دل میں اپنا گھر بنا کر جاؤں گا
عشق کیا شے ہے زمانے کو بتا کر جاؤں گا
اب سزا جو بھی زمانہ طے کرے میرے لیے
میں بھی کوئی خوبصورت سی خطا کر جاؤں گا
عشق کا منظر تمھارے سامنے آجائے گا
داستانِ دل زمانے کو سنا کر جاؤں گا
معاف کردے گا یقیناً، دیکھ کے میرا خدا
اُس کے آگے مضمحل چہرہ بنا کر جاؤں گا
جس کو حاصل کرکے دنیا بھی معطر ہوسکے
میں تیری سانسوں میں وہ خوشبو بسا کر جاؤں گا
تم کبھی مایوس نہ ہونا مرے حالات سے
مرتے مرتے بھی میں یہ وعدہ وفا کر جاؤں گا
مشکلوں کے درمیاں کمزور نہ سمجھے کوئی
حوصلہ اپنا زمانے کو دکھا کر جاؤں گا
زندگی دشوار ہے طاہر تو گھبرانا نہیں
میں اِسے ہر حال میں آساں بنا کر جاؤں گا

غزل

طالبؔ رامپوری

H-73، تھرڈ فلور، گڑھووالی محلہ، للیتا پارک، دہلی

سب سے نزدیک ہم سے اک دوری
دشمنِ جاں کی ہے یہ مجبوری
جیسا سوچا تھا وہ وہی نکلا !
سرخ چہرہ تھا آنکھ تھی بھوری
ایک جیسے ہیں سب امیروں میں
کون دیتا ہے پوری مزدوری
چٹنی روٹی کہیں نصیب نہیں
اور کہیں خوب مرغ تندوری
بیچ رستے میں کاٹ دی اُس نے
اِس سے پہلے کہ بات ہو پوری
وہ محبت ہے رات دن مجھ میں
یوں مہکتی ہے جیسے کستوری
تم یہ کیا رنگ پہنے پھرتے ہو !
اچھا لگتا لباسِ انگوری
سچ تو بولوں گا میں مگر طالبؔ
پہلے لینا پڑے گی منظوری

غزل

ڈاکٹر رؤف خیرؔ

1-137-11-9، موتی محل، گولکنڈہ، حیدرآباد

منافقوں کو مگن خاک میں ملا کے ہوا
وہ سرفرازِ جہاں خون میں نہا کے ہوا
میں سرخ رو تو وفاداریاں نبھا کے ہوا
وہ مطمئن نہ کبھی مجھ کو آزما کے ہوا
ہم اپنے آپ سے واقف ہوئے کہ ہم کیا ہیں
وہ شرم سار ہمیں بزم سے اُٹھا کے ہوا
وہیں سے اس سے بچھڑنے کا سلسلہ ٹھیرا
میں اس سے آگے جہاں بھی قدم بڑھا کے ہوا
دکھائی دیتا ہے کچھ اور اصل میں کچھ ہے
عجیب تجربہ اس کے قریب جا کے ہوا
یہاں تو اپنے قبیلے کے لوگ بیٹھے ہیں
سکون خیمۂ صدق و صفا میں آ کے ہوا
وہ خود ہی بچوں کے رحم و کرم پہ جیتا تھا
غریبِ شہر سے شرمندہ گھر بلا کے ہوا
ملال یہ ہے کہ اِک دوست کھو دیا ہم نے
کہ فائدہ نہ اُسے آئینہ دکھا کے ہوا
رؤف خیرؔ ہے اب گیند اس کے پالے میں
میں بے نیاز اُسے حالِ دل سنا کے ہوا

غزل

مدحت الاختر

وارث پورہ، کامٹی، ناگپور-441002 (مہاراشٹر)

آنسوؤں کی کیا کمی ہے
ہر تمنا ماتمی ہے

پل رہا ہے میرے اندر
ایک دُکھ جو عالمی ہے

کیا اسے کہیے کہ اس کا
مشغلہ ہی برہمی ہے

اس کی باتوں میں نہ آنا
صرف لہجہ شبنمی ہے

دھند آنکھوں پر مسلط
برف چہرے پر جمی ہے

پیار کے مندر میں بابا
ہجر کی دھونی رمی ہے

میں بھی آخر آدمی ہوں
تو بھی آخر آدمی ہے

کیا نہیں موجود مجھ میں
ایک شہرت کی کمی ہے